عہد نبوی میں صحابیات کی معاشی سرگرمیاں، عصر حاضر کی خواتین کے لئے مشعل راہ

Economic Activities of *Ṣaḥābiyāt* in Prophetic Period: A Guideline for Contemporary Women

ڈاکٹر حافظ راؤ فرحان علی*

ABSTRACT

Islam is a complete code of life which provides complete guidance in all aspects of human life. The discipline of economics was given particular importance in Islam as most of the human activities revolved around it that could also be seen practically around the globe. The major responsibility of under taking the financial matters was laid on men according to teachings of Islam. The core purpose of this academic work was to explore the Islamic view point about the woman economic activities. The study was basically designed to address that whether Islam permitted women to take part in economic affairs or not? The article provided a guideline for cotemporary women in the light of economic activities of *Ṣaḥābiyāt* that how the today's women could take part into various domains of financial matters by keeping in view the life and economic activities of *Ṣaḥābiyāt.* The descriptive and analytical research methodology was employed for the collection and analysis of data. The review of literature revealed that men were primarily responsible for economic matters, however women could do the job by following the instruction of Islamic teachings. It was also found that the women could actively take part in various economic fields including; trade, agriculture, medical science, and education. In the light of above findings the research recommended that Government should take some serious measures by making economic arrangements and providing Islamic environment for work in order to accommodate the needy, poor, widows and oppressed women of society. On one hand, it would be beneficial for the financial support of their family while on the other hand, enhance the production of country. Finally it must be kept in view that family system should not be ruined due to job of a woman.

Key words: *woman, finance, economic, Ṣaḥābiyāt, contemporary woman,* Islam

* لیکچرار، شعبہ علوم اسلامیہ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

معاش حیات انسانی کا وہ اہم ترین شعبہ ہے کہ عمرِ عزیز کا بیشتر حصہ غمِ فردا میں گزرتا ہے۔ صبح سے شام اور شام سے صبح ایک ہی فکر انسان کو گھائل کئے رکھتی ہے کہ اسے بہر صورت ضروریات زندگی کو یقینی بنانا ہے۔ عارضی معاش کی صورت میں ایک نادیدہ سا خوف، سائے کے مانند انسان کے ساتھ ساتھ رہتا ہے اور مستقل معاش کی تگ و دو کے لئے ایک محرک کا کردار ادا کرتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مذہب اسلام نے اس فطرت انسانی کا خاص خیال رکھا ہے اور جابجا حصولِ معاش کی دوڑ دھوپ کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلاةُ فَانتَشِرُوا فِي الأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ﴾[۱]

جب تم نماز ادا کرو تو پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔

﴿عَلِمَ أَن سَيَكُونُ مِنكُم مَّرْضَى وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِن فَضْلِ اللهِ﴾[۲]

وہ جانتا ہے کہ تم میں بعض بیمار ہوں گے، بعض دوسرے زمین میں چل پھر کر اللہ کا فضل تلاش کریں گے۔

معاشِ انسانی کا بہتر سے بہتر ہونا ضروری ہے اس کے لئے سرور دو عالم ﷺ نے دعا سکھلائی:

«اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الهُدَى وَالتُّقَى وَالعَفَافَ وَالغِنَى»[۳]

اے اللہ میں آپ سے ہدایت، تقویٰ، عفت اور تونگری کا سوال کرتا ہوں۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرمایا:

«نِعْمَ المال الصالح مع الرجل الصالح»[۴]

نیک آدمی کے لئے اچھا مال کیا ہی خوب ہے۔

نبی کریم ﷺ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے لئے کثرت اولاد کے ساتھ فراخیِ رزق کی دعا فرمائی۔ ارشاد فرمایا:

«اللَّهُمَّ أَكْثِرْ مَالَهُ، وَوَلَدَهُ»[۵] اے اللہ انس کے مال اور اولاد میں کثرت فرما۔

---

(۱) سورۃ الجمعۃ: ۱۰

(۲) سورۃ المزمل: ۲۰

(۳) ترمذی، امام محمد بن عیسیٰ، سنن الترمذی، باب ما جاء فی عقد التسبیح بالید، حدیث نمبر:۳۴۸۹، شرکہ مکتبہ ومطبعہ مصطفی البابی الحلبی، مصر، ۱۹۷۵ء، ۵/ ۵۲۲

(۴) تمیمی، محمد بن حبان، صحیح ابن حبان، حدیث نمبر: ۳۳۱۰، مؤسسۃ الرسالہ، بیروت، ۱۹۹۸، ۸/ ۶

(۵) بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، باب الدعاء بکثرۃ الولد مع البرکہ، حدیث نمبر:۶۳۴۴، دار طوق النجاۃ، ۱۴۲۲ھ، ۸/ ۷۵

مرد و عورت کی معاشی مساوات، ایک تحقیق

عورت کا حقیقی دائرہ کار اس کا گھر ہے جہاں وہ بچوں کی نگہداشت، نشو و نما اور تعلیم و تربیت کے فرائض سر انجام دیتی ہے۔ عورت کو فکرِ معاش سے آزاد کیا گیا ہے۔ اس پر دوسروں کی فکر تو کیا بلکہ اپنی ذمہ داری سے بھی سبکدوش ہے۔ یہ صرف اسلئے کہ عورت اپنے گھر میں کامل منہمک ہو کر اپنے فرائض ادا کر سکے۔

﴿وقرن في بيوتكن﴾ کی اصل غرض وغایت بھی یہی ہے۔ شریعت مرد سے زیادہ عورت کو تربیتِ اولاد کے لئے موزوں سمجھتی ہے۔ ایک صحابی نے جب اپنی بیوی کو طلاق دی اور بچے کو اپنے پاس رکھنا چاہا مگر بچے کی والدہ نے شکایت کی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا أنت أحق به تم ہی اس کی زیادہ حق دار ہو جب تک دوسرا نکاح نہ کرلو۔[1] عورت گھر کی منتظم ہے لہٰذا اس کا فرض ہے کہ وہ اس کا انتظام خوش اسلوبی سے چلائے۔ صفائی، ستھرائی کا اور افرادِ خانہ کے لباس و خوراک کا خاص خیال اس طرح رکھے کہ گھر چین و سکون کا گہوارہ بن جائے۔ شریعت اسلامیہ کی نگاہ میں عورت کا اپنے اصل دائرہ کار سے جمار ہنا بہت ضروری ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ اجتماعی اور تمدنی معاملات میں حصہ لے۔ شریعت اسلامیہ کو وہ نقصانات جو تمدنی میادین میں عورت کی عدم شراکت سے واقع ہوتے ہیں، قابل برداشت ہیں مگر گھر کا نقصان برداشت نہیں۔ اس لئے کہ گھر کا معاملہ صرف دو افراد یعنی میاں بیوی ہی کے مابین نہیں بلکہ دو خاندانوں اور اس کے سینکڑوں افراد کے مابین ہے۔ شریعت اسلامیہ اجتماعی عبادات میں بھی حصہ لینے کی بجائے عورت سے اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ عبادات بھی اپنے گھر میں ہی بجالائے۔ عورت سے نماز جمعہ کا ساقط ہونا اس کی بین دلیل ہے۔[2] گھر میں رہ کر خاوند کی خدمت کرنا عورت کا جہاد ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: «عَلَيْكُنَّ بِالْبَيْتِ، فَإِنَّهُ جِهَادُكُنَّ»[3] کہ تمہارا گھر میں بیٹھنا ہی جہاد ہے۔ سوال یہ ہے کہ مَردوں کی طرح کیا عورتوں کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ معاشی شعبے میں اپنی خدمات بجالا سکیں؟ اور پھر اس کے درجات کیا ہیں؟ کیا صرف حاجت مند عورت کو ہی معاش کی اجازت ہے یا فارغ البال اور خوشحال عورت بھی اس میدان میں قدم رکھ سکتی ہے؟ نیز عورت کے معاشی میادین کون سے ہیں جہاں وہ اپنی خدمات احسن طریقے سے یوں انجام دے سکتی ہے کہ شرعی حوالے سے جواز کی حد تک اس پر اعتراض نہیں؟

قرآن و حدیث میں غور و فکر کے بعد یہ سمجھ آتی ہے کہ معاشی تگ و دو کا بنیادی فریضہ تو مرد کے سر ہے تاہم عورت کے لئے اس کی ممانعت نہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

---

(۱) سنن ابو داؤد، کتاب الطلاق، باب من احق بالولد، حدیث نمبر: ۲۲۷۶، المکتبۃ العصریہ، صیدا، بیروت، ۲/ ۲۷۶

(۲) سنن ابو داؤد، کتاب الصلوۃ، باب الجمعہ للمملوک والمرأۃ، حدیث نمبر: ۱۰۶۷، ۱/ ۲۸۰

(۳) امام احمد بن محمد بن حنبل، مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۴۳۹۳، تحقیق: شعیب الأرنؤوط، عادل مرشد، موسسہ الرسالۃ، ۲۰۰۱، ۴۰/ ۴۵۸

﴿وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ﴾ (۱)

کہہ دیجئے کہ تم عمل کئے جاؤ تمہارے عمل اللہ خود دیکھ لے گا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ﴾ (۲)

اے ایمان والو! اپنے آپس کے مال ناجائز طریقہ سے مت کھاؤ مگر یہ کہ تمہاری آپس کی رضامندی سے ہو خرید و فروخت۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَى أَجَلٍ مُسَمًّى فَاكْتُبُوهُ﴾ (۳)

اے ایمان والو جب تم آپس میں ایک دوسرے سے میعاد مقررہ پر قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔

﴿وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ﴾ (۴)

اور اپنے میں سے دو مرد گواہ رکھ لو۔ اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جنہیں تم گواہوں میں پسند کر لو۔

﴿وَلَا تَسْأَمُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَى أَجَلِهِ ذَلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنَى أَلَّا تَرْتَابُوا إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا وَأَشْهِدُوا إِذَا تَبَايَعْتُمْ وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ﴾ (۵)

اور قرض کو جس کی مدت مقرر ہے خواہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو لکھنے میں کاہلی نہ کرو، اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بات بہت انصاف والی ہے اور گواہی کو بھی درست رکھنے والی ہے، شک و شبہ سے بھی زیادہ بچانے والی ہے، ہاں یہ اور بات ہے کہ معاملہ نقد تجارت کی شکل میں ہو۔ جو آپس میں تم لین دین کر رہے ہو تم پر اس کے نہ لکھنے میں کوئی گناہ نہیں۔ خرید و فروخت کے وقت بھی گواہ مقرر کر لیا کرو۔

درج بالا تمام آیات میں عموم ہے اور تجارت کرنے، قرض اور دین کا معاملہ لکھنے، گواہ بننے اور بنانے کے

---

(۱) سورۃ التوبہ:۱۰۵

(۲) سورۃ النساء:۲

(۳) ایضًا:۲۹

(۴) سورۃ البقرہ:۲۸۲

(۵) ایضًا:۲۸۲

احکامات جیسے مردوں کو ہیں ویسے ہی ان کی مخاطب عورتیں بھی ہیں۔ جس طرح مرد کسی کا مال ناجائز طریقے سے نہیں ہتھیا سکتا اسی طرح عورت کو بھی اس کی اجازت نہیں۔ خرید و فروخت اور دیون کے معاملات میں جس طرح مرد گواہ بن سکتا ہے، اسی طرح عورت کو بھی اسکی ممانعت نہیں۔ سود کی ممانعت اور اس کی حلت جس طرح مردوں کے لئے ہے اسی طرح اس کا محل عورتیں بھی ہیں۔

صحابیات کی معاشی سرگرمیاں

شریعت اسلامی کے بنیادی ماخذ قرآن و حدیث ہیں۔ عہد رسالت میں قرآن کا نزول ہوا ہے اور حدیث کی ابتدا و انتہاء بھی۔ اس مبارک دور میں جو مرد و خواتین آپ ﷺ پر ایمان لائے، انہیں صحابہ و صحابیات کے القابات سے نوازا گیا ہے۔ زیر نظر مقالہ چونکہ خواتین کی معاشی سرگرمیوں سے متعلق ہے، لہٰذا ذیل کی سطور میں صحابیات کی معاشی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے ادوار میں کس طرح سے معاشی سرگرمیاں انجام دیں تاکہ عصر حاضر کی خواتین کے لئے انہیں مشعل راہ ثابت کیا سکے۔

تجارت

قرآن کریم نے تجارت کے لفظ کو بار بار دہرایا ہے اس لئے کہ اللہ تعالی نے تجارت کے پیشہ میں بہت برکت رکھی ہے۔ حدیث میں بھی تجارت کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ دس حصوں میں سے نو حصے رزق اللہ نے تجارت میں رکھا ہے[1]۔ امام ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا کہ آپ کی نظر میں سچا تاجر زیادہ بہتر ہے یا وہ شخص جس نے اپنے آپ کو عبادت کے لئے وقف کر رکھا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ میرے نزدیک سچا تاجر زیادہ بہتر ہے۔ اس لئے کہ وہ حالت جہاد میں ہے۔ شیطان ہر طرف سے اسے پھسلانے کی کوشش کرتا ہے کبھی ناپ تول میں کمی بیشی کا کہتا ہے تو کبھی لین دین میں مکر بازی کی چالیں سمجھاتا ہے لیکن وہ تاجر ان سب سے انکار کر کے جہاد کرتا ہے۔[2] عہد رسالت میں صحابیات تجارت سے وابستہ تھیں جن کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے:

عطریات

انسان کی فطرت ہے کہ وہ خوشبو کو پسند کرتا ہے اور بدبو سے نفرت کرتا ہے۔ اسلام جو کہ دین فطرت ہے خوشبو کی ترغیب دیتا ہے۔ نبی کریم ﷺ ہمہ وقت خوشبو سے معطر رہتے تھے۔ صحابیات میں سے حضرت اسماء بنت مخرمہ رضی اللہ عنہا عطر کا کاروبار کرتی تھیں۔ ابن سعد فرماتے ہیں کہ ان کا بیٹا عبد اللہ بن ربیعہ یمن سے عطر خرید کر انہیں

---

(۱) ابن حجر عسقلانی، احمد بن علی بن محمد، المطالب العالیہ بزوائد المسانید الثمانیہ، دار العاصمہ، السعودیہ، ۱۴۱۹ھ، ۷/ ۳۵۲

(۲) غزالی، ابو حامد محمد بن محمد، احیاء علوم الدین، دار الفکر بیروت، ۲/ ۶۲

بھیجتا تھا اور وہ اسے فروخت کرتی تھیں۔ ربیع بنت معوذ کہتی ہیں کہ ہم چند عورتوں نے ان سے عطر خریدا۔ جب انہوں نے ہماری بوتلیں عطر سے بھر دیں تو گویا ہوئیں "اكتبن لي عليكن حقي" میری جو رقم تمہارے ذمہ واجب الاداء ہے، مجھے لکھ دو[۱]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عطر کی خرید و فروخت نقد کے ساتھ ساتھ ادھار پر بھی کیا کرتی تھیں۔

حضرت خولہ بنت توقیت رضی اللہ عنہا اس قدر عطر فروخت کرتی تھیں کہ وہ عطارہ کے نام سے مشہور ہو گئیں تھیں۔ جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر تشریف لاتیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں عطر کی خوشبو سے پہچان لیا کرتے تھے۔ ایک دن وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر تشریف لائیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تم نے ان سے کچھ خریدا نہیں؟ انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آج یہ عطر فروخت کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ اپنے خاوند کی شکایت لیکر آئی ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شکایت کا ازالہ کیا۔[۲]

حضرت سائب بن اقرع ثقفی رضی اللہ عنہ کی والدہ حضرت مکبلہ عطر فروشی کا کام کرتی تھیں۔ حضرت سائب فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میری والدہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس عطر فروخت کرنے کی غرض سے حاضر ہوئیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عطر کی خریداری کے بعد ان سے ان کی حاجت کے بارے میں دریافت فرمایا۔ انہوں نے عرض کیا کہ حاجت تو کوئی نہیں البتہ اپنے چھوٹے بچے، جو ان کے ساتھ تھا، کے لئے دعا کی درخواست کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ان کے لئے دعا فرمائی۔[۳]

درج بالا تمام واقعات سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ عورت تجارت و کاروبار میں حصہ لے سکتی ہے۔ عصرِ حاضر میں تجارت و کاروبار کا ایک وسیع میدان عورتوں سے متعلق ہے جس میں عورتوں کے ملبوسات اور زیب و زینت کی بے شمار اشیاء شامل ہیں۔ اگر عورتیں تجارت میں حصہ لینا چاہتی ہیں تو ان کے لئے بہترین مواقع عورتوں سے متعلقہ اشیاء ہیں جن سے دُہرا فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ عورت رزقِ حلال میں حصہ لے سکتی ہے اور دوسرے یہ کہ خریدار عوتوں سے شرم و حیاء کا دامن بھی نہیں چھوٹتا۔ نہایت افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے اور اس سے زیادہ، تکلیف سے یہ بات سہنا پڑتی ہے کہ ہمارے ہاں شرم و حیاء کی دھجیاں اڑا کر یہ کام مَردوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے جس کے مُضر اثرات سب کے سامنے ہیں۔

---

(۱) ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، تحقیق: محمد عبد القادر عطا، دار الکتب العلمیہ، طبع اول: ۱۹۹۰، ۸/ ۲۲۰، ابو غضہ، زکی علی السید، عمل المراۃ بین الادیان والقوانین ودعاۃ التحریر،، دار الوفاء للطباعۃ والنشر، طبع اول: ۲۰۰۷، ص: ۱۷۴

(۲) ابن الاثیر، محمد بن محمد بن عبد الکریم، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ، تحقیق: علی محمد معوض، عادل احمد عبد الموجود، دار الکتب العلمیہ، طبع اول: ۱۹۹۴، ۵/ ۴۳۲

(۳) ایضاً، ۷/ ۲۶۰

زراعت وکاشتکاری

زراعت وکاشتکاری معاشی سرگرمیوں کی بنیاد ہے۔روزِ اول سے ابتدائی معاشی سرگرمیوں میں زراعت و کاشتکاری ہی رہی ہے۔انسان نے سب سے پہلے زمین پر اگایا اور پھر اسی سے کھایا۔حضرت آدم علیہ السلام کا پیشہ بھی زراعت وکاشتکاری ہی تھا۔حضرت موسی علیہ السلام کے قصے میں، جب وہ مصر کو چھوڑ کر مدین روانہ ہوئے تو آٹھ دن کی مسافت کے بعد ایک کنوئیں پر پہنچے جہاں لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے تھے اور ازدہام کی کیفیت تھی۔ایک طرف کو دولڑکیاں اپنی بکریوں روکے کھڑی تھیں۔آپ علیہ السلام نے ان سے دریافت فرمایا کہ تم یہاں کیوں کھڑی ہو؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہم اس انتظار میں ہیں کہ یہ چرواہے اپنے جانوروں کو پانی پلا کر چلے جائیں گے تو ہم اپنے جانوروں کو پانی پلائیں گی۔[۱] گویا حضرت شعیب علیہ السلام کے گھر کا دارومدار مویشی پالنے اور زراعت پر تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پیشے کی فضیلت یوں بیان فرمائی کہ جو شخص درخت لگاتا ہے یا کچھ اُگاتا ہے، پھر اس سے کوئی پرندہ، انسان یا جانور کھالیتا ہے تو یہ (اس کا کھانا) اس کے لئے صدقہ ہے۔[۲] زراعت اپنے بیش بہا فوائد کی بناء پر کس قدر ضروری ہے؟اس کا اندازہ تو اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ گوارانہ تھا کہ زمین کا کوئی قطعہ یونہی خالی پڑا رہے اور اس سے پیداوار حاصل نہ کی جائے اس لئے کہ زمین اللہ کی نعمت ہے اور نعمت کی قدر اسی میں ہے کہ اسے ضائع ہونے سے بچایا جائے اور جس قدر فوائد اٹھائے جاسکتے ہیں، اٹھائے جائیں۔اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے بنجر زمین کو آباد کیا تو وہ اسی کے لئے ہے۔[۳] دوسری جگہ فرمایا کہ اگر کسی شخص کے پاس زمین ہے تو اول اسے خود کاشت کرنی چاہئے، اگر وہ خود کاشت نہیں کر سکتا تو اس کو چاہئے کہ وہ اسے اپنے بھائی کو دے دے۔[۴] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جو شخص زمین کو بے کار اور بے کاشت رکھے اس کا حق تین سال کے بعد ساقط ہو جائے گا۔[۵]

گو کہ یہ پیشہ سخت جان اور بلند ہمت کا متقاضی ہے۔اس میں کڑکتی سردی بھی برداشت کرنا پڑتی ہے اور تپتی دھوپ بھی، لہذا اس شعبے کے لئے مرد ہی زیادہ موافق ہیں اور وہی اسے سنبھالتے آئے ہیں مگر بوقت ضرور یا بامر مجبوری عورتیں بھی اسے اپنا سکتی ہیں۔حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ان کی خالہ کو طلاق ہو گئی تو انہوں نے چاہا کہ وہ اپنی کھجوروں کی خبر لیں تو ایک شخص نے انہیں ڈانٹا (کہ وہ دوران عدت گھر سے نکل رہی ہیں) وہ

---

(۱) کیلانی، مولانا عبد الرحمان، تفسیر تیسیر القرآن، سورۃ القصص، آیت نمبر ۲۳، حاشیہ نمبر: ۳۲

(۲) قشیری، مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۵۵۳، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۳/۱۱۸۹

(۳) سجستانی، سلیمان بن اشعث، سنن ابو داؤد، حدیث نمبر: ۳۰۷۳، المکتبۃ العصریہ، صیدا، بیروت، ۳/۱۷۸

(۴) صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۵۳۶، ۳/۱۱۶۷

(۵) امام ابو یوسف، کتاب الخراج، المکتبۃ الازہریہ للتراث، قاہرہ، ۱/۱۱۴

آپ ﷺ کے پاس تشریف لے آئیں اور قصہ عرض کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیوں نہیں؟ تم جاؤ اپنی کھجوروں کی دیکھ بھال کرو۔ عین ممکن ہے کہ تم اس کی کمائی سے صدقہ خیرات یا کوئی اور نیکی کا کام کرو۔[۱] سید جلال الدین انصر اس کے ذیل میں رقم طراز ہیں "ان الفاظ کے ذریعے آپ ﷺ نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی خالہ کو انسانیت کی بہی خواہی اور فلاح و بہبود پر اکسایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت عورت کو اس قابل دیکھنا چاہتی ہے کہ وہ اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی خدمت کر سکے اور اس کے ہاتھوں بھلے کام انجام پائیں"[۲]۔ ام مبشر انصاریہ کا ایک کھجوروں کا باغ تھا، آپ ﷺ ان کے کھجوروں کے باغ میں تشریف لائے اور دریافت فرمایا کہ یہ کھجوریں کسی مسلمان کی ہیں یا کافر کی؟ انہوں نے عرض کیا کہ مسلمان کی ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا جو شخص درخت لگاتا ہے یا کچھ اُگاتا ہے، پھر اس سے کوئی پرندہ، انسان یا جانور کھا لیتا ہے تو یہ (اس کا کھانا) اس کے لئے صدقہ ہے۔[۳]

درج بالا دونوں قصوں سے معلوم ہوا کہ عہد رسالت میں صحابیات شعبہ زراعت سے بھی وابستہ تھیں اور ان کے اپنے اپنے باغات ہوتے تھے جس کی وہ دیکھ بھال بھی کرتی تھیں۔ دیکھ بھال میں جو کام اپنے کرنے کے ہیں، وہ خود بھی بجالائے جاسکتے ہیں اور جو کام صنف نازک کے بس سے باہر ہوں، ان میں خادم بھی رکھا جاسکتا ہے مثلاً فصل کو پانی لگانا، درختوں سے پھل اتارنا وغیرہ وغیرہ۔

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما کہتی ہیں کہ میری زبیر سے شادی ہوئی تو نہ ان کی کوئی زمین تھی اور نہ ہی کوئی مال، البتہ ایک اونٹ تھا جو پانی لادنے کے کام آتا تھا اور ایک گھوڑا۔ میں خود گھوڑے کو چارہ ڈالتی اور پانی بھر کے لاتی، آٹا گوندھتی۔ مجھے روٹی پکانا نہ آتی تھی۔ انصار کی عورتیں، جو بڑی ہی مخلص تھیں، وہ مجھے روٹی پکا کے دے دیتیں۔ آپ ﷺ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو ایک قطعہ اراضی دے دیا تھا جو میرے گھر سے تین فرسخ کی مسافت پر تھا، میں وہاں جاتی اور کھجور کی گٹھلیاں چن کر لاتی۔ ایک دن میں گٹھلیاں لے کر آرہی تھی اور گٹھڑی میرے سر پر تھی کہ راستے میں آپ ﷺ سے ملاقات ہو گئی۔ آپ ﷺ کے ساتھ انصار کی ایک جماعت بھی تھی۔ آپ ﷺ نے مجھے بلایا اور اونٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا کہ میں آپ ﷺ کے پیچھے بیٹھوں۔ مجھے بیٹھنے سے حیا آئی اور زبیر رضی اللہ عنہ کی غیرت کا خیال آیا۔ آپ ﷺ نے اس کو بھانپ لیا اور چل دیئے۔ میں نے گھر آکر سارا قصہ زبیر رضی اللہ عنہ کو بتایا وہ کہنے لگے کہ تمہارا کھیت سے گٹھلیاں لانا مجھ پر بڑا گراں گزرتا ہے یہاں تک کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مجھے ایک خادم

---

(۱) صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۴۸۳، ۲/۱۱۲۱

(۲) جلال الدین انصر، عورت اسلامی معاشرہ میں، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۵، ص: ۱۲۴

(۳) صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۵۵۳، ۳/۱۱۸۹

دے دیا جو گھوڑے کی تمام تر دیکھ بھال کرتا تھا۔ اس کے آنے کے بعد مجھے ایسا لگا کہ مجھے آزادی مل گئی ہو[۱]۔

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک عورت اپنے کھیت میں ایک سبزی (سلق، چقندر) اگایا کرتی تھی۔ جمعہ کے دن وہ اس کا سالن بنایا کرتی تھی، ہم جمعہ کی نماز کے بعد اس کے گھر چلے جاتے۔ اسے سلام کرتے اور وہ ہمارے لئے کھانا لگا دیتی۔ ہم پورا ہفتہ، جمعہ کا انتظار صرف اسی لئے کرتے تھے (کہ نماز جمعہ کے بعد کھانا ملے گا)۔[۲]

معاویہ بن حکم سلمی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میری ایک لونڈی تھی جو میری بکریاں چرایا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ بھیڑیے نے حملہ کیا اور ایک بکری کو کھا گیا تو مجھے غصہ آیا اور میں نے اسے ایک تھپڑ چہرے پر دے مارا۔ بعد میں مجھے افسوس ہوا کہ یہ میں نے کیا کر ڈالا تو میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور قصہ عرض کرنے کے بعد دریافت کیا کہ کیا میں اسے آزاد کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس لونڈی کو میرے پاس لاؤ۔ میں اسے لیکر حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے دریافت فرمایا کہ اللہ کہاں ہے؟ اس نے کہا آسمانوں میں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا میں کون ہوں؟ تو اس نے کہا آپ اللہ کے رسول ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسے آزاد کر دو یہ مؤمنہ ہے۔[۳]

میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا کے ہاں کام کاج کے لئے ایک بچی تھی، جسے انہوں نے آزاد کر دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب آپ کے ہاں تشریف لائے تو آپ نے آگاہ کیا کہ میں نے باندی کو آزاد کر دیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کیا واقعی؟ انہوں نے عرض کیا جی ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ بہتر ہوتا کہ تم اسے اپنے بھائی کو بکریاں چرانے کے لئے ہدیہ کر دیتیں۔[۴]

درج بالا واقعات میں اس بات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ ملازمت پیشہ خواتین میں آزاد اور باندی ہر دو قسم کی خواتین شامل تھیں جو زراعت اور مال مویشی کی دیکھ بھال میں حصہ لیتی تھیں۔ دورِ حاضر میں جانوروں کی افزائشِ نسل اور پھر ان سے گوشت اور دودھ کی پیداوار ڈیری اور لائیو سٹاک فارمنگ سے عبارت ہے جو کہ وقت کی اشد ضرورت ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی میں غذا کی ضروریات کو پورا کرنا حکومت کا کام ہے جس کے لئے بلاشبہ افرادی قوت درکار ہے۔ دیہی خواتین میں مویشی پالنے، مرغیاں رکھنے کا پہلے ہی رواج ہے مگر یہ منظم طریقے سے نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت جدید خطوط پر ڈیری صنعت کو استوار کرے۔ اعلیٰ نسل کے مویشی دیہی خواتین کو فراہم کرے۔ پھر ان کے طبی معائنے، دوا علاج کی خدمات مہیا کرے۔ حکومت کے موجودہ شفاخانہ حیوانات اس سلسلے میں

---

(۱) صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۵۲۲۴، ۷/ ۳۵

(۲) ایضاً، حدیث نمبر: ۹۳۸، ۲/ ۱۳

(۳) صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۵۳۷، ۱/ ۳۸۱

(۴) صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۵۲، ۳/ ۱۵۸

بالکل ناکافی ہیں۔ باقی رہی سہی کسر کرپشن پوری کر دیتی ہے اور ایک عام کسان کو اپنے جانوروں کے لئے انجیکشن تک مشکل سے میسر آتا ہے۔ اس کے بعد سب سے اہم قدم حکومت کی جانب سے دودھ کی پیداوار کے حصول کے بعد دیہاتوں سے اس کی وصولی ہے۔ ذرائع نقل و حمل کی مشکلات اور صنفی نزاکت کے سبب دیہاتی خواتین اس قابل نہیں ہوتیں کہ وہ اپنی مصنوعات کو قریبی منڈیوں میں فروخت کر سکیں۔ چاروناچار انہیں انہی افراد کا سہارا لینا پڑتا ہے جو ان کے دروازے پر چیز کو وصول کرے۔ یہ چیز صحیح قیمت کے تعین میں آڑے آتی ہے اور خاتون کسان کو وہ قیمت نہیں مل پاتی جو اس کی محنت تقاضا کرتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شہروں میں قائم ملک شاپ کی برانچیں دیگر شہروں میں پھیل جاتی ہیں لیکن خاتون کسان کا گھر یونہی کچے کا کچہ رہتا ہے۔

زراعت اگر معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہے تو یہ عورتیں اس کی افرادی قوت ہیں۔ مئی جون کی جان لیوا گرمی میں جیسے مرد گندم کی کٹائی حصہ لیتے ہیں تو عورتیں بھی ان کے برابر کٹائی میں شریک ہوتی ہیں اور بائیس کروڑ عوام کے لئے خوراک کا بندوبست کرتی ہیں۔ یہ عورتیں اپنے خاندان سمیت جس طرح سے ملکی معیشت میں حصہ لے رہی ہے وہ انتہائی حوصلہ افزاء اور باعث ترغیب ہے۔ درج ذیل اعداد و شمار اس دعوے کو کچھ یوں ثابت کرتے ہیں:

وطن عزیز کی ملکی معیشت میں زراعت کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی سی ہے جو ۴۲ء۲ فیصد افراد کو روزگار فراہم کر رہا ہے۔ ملکی مجموعی پیداوار میں یہ شعبہ ۱۹ء۸ فیصد اضافے کا باعث ہے۔[۱]

پاکستان میں تقریبا آٹھ ملین یعنی اسی لاکھ افراد لائیو اسٹاک سے وابستہ ہیں۔ مالی سال ۲۰۱۵-۲۰۱۶ میں مجموعی ملکی پیداوار میں لائیو اسٹاک کا حصہ ۱۱ء۷ فیصد تھا۔ دودھ کی پیداوار ۸۰۰۰، ۳۲، ۵۴ ٹن اور گوشت کی پیداوار ۳۸۷۳۰۰۰ ٹن ہوئی۔[۲] لائیو اسٹاک میں دودھ کی پیداوار، گوشت، چربی، جانوروں کی کھالیں، اون اور دیگر اشیاء حاصل ہوتی ہیں۔ جن کی بدولت بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے کھانے پینے یہاں تک کہ رہنے سہنے اور ملبوسات تک کے لئے بندوبست ممکن ہوا ہے۔

پولٹری کا شعبہ ایک اعشاریہ پانچ ملین یعنی ۱۵ لاکھ افراد کو روزگار فراہم کر رہا ہے۔ ۲۰۰ ارب سے زائد کی سرمایہ کاری اس شعبے میں کی گئی ہے۔ پاکستان کا شمار پولٹری فراہم کرنے والے گیارہویں بڑے ملک کے طور پر ہوتا ہے جو کہ ایک اعشاریہ دو ارب بوائلر مرغیاں سالانہ پیدا کر رہا ہے۔ گوشت کی کل پیداوار میں تیس فیصد حصہ پولٹری کا بھی ہے۔ ۲۰۱۶-۲۰۱۵ میں مجموعی ملکی پیداوار میں پولٹری کا حصہ ایک اعشاریہ چار فیصد ہے۔ ۱۵۱ء۲، ارب روپے پولٹری سے حاصل ہوتے ہیں۔ درج بالا اعداد و شمار تو ایسے ماحول کے ہیں جہاں حکومتی حوصلہ افزائی نہ

---

(۱) Economic Survey of Pakistan, 2015-16 (Islamabad: Ministry of finance), 39

(۲) Ibid, 40

ہونے کے برابر ہے اگر حکومت خلوصِ دل اور دیانتداری سے اپنا کردار ادا کرے تو وہ دن دور نہیں جب وطن عزیز کا شمار ان ممالک میں ہو گا جن کی معیشتیں نہایت مستحکم ہیں۔(۱)

دستکاری

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زوجہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا دستکاری سے واقف تھیں اور اس کے ذریعے اپنے بچوں یہاں تک کہ خاوند کے اخراجات کا بندوبست کرتی تھیں۔ایک دن وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئیں اور کہنے لگیں کہ میں دستکاری سے خوب واقف ہوں اور چیزیں بنا کر فروخت کرتی ہوں۔میرے بیٹے اور خاوند کے پاس کوئی کام کاج نہیں ہے۔میں ہی ان پر خرچ کرتی ہوں اور ان پر خرچ کرنے کی وجہ سے میں غرباء پر صدقہ نہیں کر سکتی تو کیا بیٹے اور خاوند پر خرچ کرنے سے مجھے اجر ملے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیوں نہیں؟ تم ان پر جو بھی خرچ کرو گی، تمھیں اس کا اجر ضرور ملے گا۔(۲) ام المؤمنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا اپنے ہاتھ سے طرح طرح کی چیزیں تیار کر کے انہیں فروخت کرتیں اور جو کمائی انہیں حاصل ہوتی اسے راہ خدا میں صدقہ کر دیا کرتی تھیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے بہتر کوئی نہ دیکھی جو اپنے ہاتھ سے کما کر صدقہ و خیرات کیا کرتی تھیں۔(۳) وہ صرف صدقہ و خیرات کے لئے اشیاء تیار کرتی تھیں وگرنہ انہیں اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے اس کی قطعاضرورت نہ تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ نہ صرف مجبوری کے عالم میں عورت کو کمانے کی اجازت ہے بلکہ اپنی دنیاو آخرت کی بہتری کے لئے بھی عورت کما سکتی ہے۔

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک عورت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک چادر لے کر آئی جس کے کنارے بُنے ہوئے تھے۔(معلوم ہوا کہ عورتیں اپنے گھروں میں کشیدہ کاری سے بھی وابستہ تھیں)اس نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ چادر میں نے اپنے ہاتھ سے بُنی ہے تاکہ میں اسے آپ کو پہناؤں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا یہ ہدیہ قبول فرمایا۔ایک آدمی نے اسے دیکھ کر سوال کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ یہ چادر مجھے دے دیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ٹھیک ہے تم لے لو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ چادر تہہ کروا کر اس آدمی کو بھجوادی۔لوگوں نے اس آدمی سے کہا کہ تم بھی عجیب ہو۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چادر کا سوال کر ڈالا، تمہیں معلوم نہیں کہ وہ کسی سائل کا سوال رَد نہیں فرماتے۔اس شخص نے کہا اللہ کی قسم، میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ چادر صرف اسلئے مانگی کہ بوقت موت یہ میرا کفن بن سکے۔ سہل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب اس شخص کی موت ہوئی تو یہ چادر اس کا کفن تھی۔(۴)

---

(۱) Economic Survey of Pakistan, 22

(۲) مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۵،۱۶۰۸۶/ ۴۹۴

(۳) صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۴،۲۴۵۲/ ۴،۱۹۰۷، اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ، ۵/ ۴۹۴

(۴) صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۳،۲۰۹۳/ ۶۱

کاروبار کی نگرانی

عہد رسالت میں عورتیں نہ صرف یہ کہ اپنے کاروبار میں نہ صرف یہ کہ خود حصہ لیتی تھیں اور بطور کارکن خود ہی کام کرتی تھیں بلکہ اس بات کے ثبوت بھی ملتے ہیں کہ وہ خود کاروبار کی ادارت اور نگرانی کرتیں اور کام کاج کوئی اور کرتا تھا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ انصار کی ایک عورت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ عرض کیا کہ کیا میں آپ کے لئے ایک منبر نہ بنوادوں جس پر آپ تشریف فرما ہوا کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اگر تم چاہو تو بے شک بنوادو، تو اس عورت نے منبر بنوا کر دیا۔ جمعہ کے روز آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی پر تشریف فرما ہوتے اور خطبہ ارشاد فرماتے۔(۱) حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی تجارت بھی کچھ اسی طرح کی تھی کہ وہ اپنا مال مضاربت پر دے کے خود کاروبار کی نگرانی کرتیں تھیں اور منافع مضاربین اور اپنے مابین تقسیم کر لیتی تھیں۔ آپ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مضاربت کی بنیاد پر مال دیا تھا جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فروخت کیا تو دُگنا منافع ہوا تھا۔

خولہ بنت ثعلبہ رضی اللہ عنہا کے خاوند نے ان سے ظہار کیا۔ وہ دونوں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مسئلہ پوچھنے کی غرض سے تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تک کوئی حکم نہیں آجاتا تم اپنی بیوی سے دور رہو۔ حضرت خولہ نے عرض کیا:

"يَا رَسُولَ اللّٰهِ مَا لَهُ مِنْ شَيْءٍ وَمَا يُنْفِقُ عَلَيْهِ إِلا أَنَا"(۲)

کہ میرے خاوند کے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ ان پر تو میں ہی خرچ کرتی ہوں۔

درج بالا واقعات کی روشنی میں خواتین گھریلو دستکاری کو احسن طریقے سے فروغ دے سکتی ہیں جن میں سلائی کڑھائی، ملبوسات پر فینسی کام، قالین بافی، کھانے پینے کی اشیاء کے خام مال کی تیاری، چھوٹے پیمانے پر مختلف اشیاء کی پیکنگ، کھیلوں کے سامان کی تیاری وغیرہ شامل ہے۔ یہ کام وہ بذات خود بھی سرانجام دے سکتی ہیں اور اگر وہ ملازمین کے ذریعے کروانا چاہیں تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ شرعی امور کی پاسداری رہے۔ اس سلسلے میں حکومت پنجاب نے کچھ اقدامات بھی کئے ہیں جو کہ قابل ستائش ہیں۔ مثال کے طور پر ووکیشنل ٹریننگ انسٹیٹیوٹ میں فیشن ڈیزائننگ، ٹیلرنگ اور کمپیوٹر اپلی کیشنز کے تین سے آٹھ ماہ تک کے کورسز مفت کروائے جاتے ہیں اور ماہانہ وظیفہ بھی دیا جاتا ہے۔ خواتین کو چاہئے کہ وہ ان اقدامات سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے گھروں میں کمپیوٹر کورسز، چھوٹے پیمانے پر سافٹ وئیر کی تیاری، ٹیلرنگ شاپ قائم کرکے اپنا معیار زندگی بلند کریں۔

---

(۱) صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۰۹۵، ۳/۶۱

(۲) ابن سعد، ابو عبد اللہ محمد بن سعد، الطبقات الکبری، دار صادر، بیروت، ۱۹۶۸، ۸/۳۷۸

طبابت

عہد رسالت میں بہت سی صحابیات طبابت کے پیشے سے بھی وابستہ تھیں۔ صحابیات جنگوں میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تشریف لیجاتیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کا فیضہ سر انجام دیا کرتی تھیں۔ ان میں سے ایک بنو اسلم کی حضرت رفیدہ انصاریہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ:

وكان رسول الله ﷺ حين أصاب سعدا السهم بالخندق، قال لقومه:"اجعلوه في خيمة رفيدة حتى أعوده من قريب، وكان رسول الله ﷺ يمر به فيقول: " كيف أمسيت وكيف أصبحت؟ " فيخبره"[1]

غزوہ خندق میں جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ تیر سے زخمی ہوگئے تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ انہیں رفیدہ رضی اللہ عنہا کے خیمے میں منتقل کر دیا جائے تاکہ میں قریب سے ان کی عیادت کر سکوں۔۔۔ نبی کریم ﷺ ان کے خیمے کے پاس سے گزرتے تو سعد رضی اللہ عنہ کا حال دریافت فرماتے کہ صبح طبیعت کیسی تھی اور شام کیسی گزری تو سعد رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کو اپنا حال بتاتے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ غزوات میں ام سلیم رضی اللہ عنہا اور انصار کی عورتیں نبی کریم ﷺ کے ہمراہ ہوتی تھیں جو جنگ کے دوران پانی بھر کر لاتیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کیا کرتی تھیں۔[2] ام عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں سات غزوات میں نبی کریم ﷺ کے ہمراہ رہی۔ میں مجاہدین کے لئے کھانا بناتی، زخموں کی مرہم پٹی کرتی اور بیماروں کی دوا کرتی تھی۔[3] خارجہ بن زید رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ام علاء رضی اللہ عنہا نے انہیں بتایا کہ عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو، ان رہائش گاہوں میں جو انصار نے مہاجرین کے لئے وقف کر دی تھیں، بخار ہوا اور وہ ہمارے ہاں مریض ٹھہرے یہاں تک کہ ان کی وفات ہوگئی۔[4]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جناب نبی کریم ﷺ نے انصار کی عوتوں کو بخار اور کانوں کے امراض کے علاج کی اجازت دی تھی۔ درج بالا واقعات یہ شہادت پیش کرتے ہیں نہ صرف یہ کہ عورت معالج بن

---

(۱) ابن حجر العسقلانی، احمد بن علی بن محمد، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ، رقم الحدیث: ۶۹۲۵، ۸/ ۱۱۱، الاصابہ فی تمییز الصحابہ، تحقیق: عادل احمد عبد الموجود و علی محمد معوض، رقم الحدیث: ۱۱۷۷، دار الکتب العلمیہ، بیروت، طبع اول: ۱۴۱۵ھ، ۸/ ۱۳۶، طبقات الکبریٰ، تحقیق: محمد عبد القادر عطا، دار الکتب العلمیہ، طبع اول: ۱۹۹۰، ۸/ ۲۸۱

(۲) صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۸۱۰، ۳/ ۱۴۴۳

(۳) ایضًا، حدیث نمبر: ۱۸۱۲، ۳/ ۱۴۴۷

(۴) صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۱۲۴۱، ۲/ ۷۲

سکتی ہے بلکہ وہ مردوں کا علاج بھی کر سکتی ہے بشرطیکہ فتنے کا خوف نہ ہو۔ وطن عزیز میں اس وقت صحت کی صورتحال سرکاری سطح پر زبوں حالی کا شکار ہے جس کا اندازہ درج ذیل کے اعداد وشمار سے لگایا جاسکتا ہے:

پاکستان میں اس وقت سرکاری سطح پر ۱۱۶۷ ہسپتال، ۵۹۶۵، ڈسپنسریاں، ۵۴۶۴ بنیادی مراکز صحت اور ۷۳۳ میٹرنٹی ہومز ہیں جن میں ۱۱۷۱۸۴ ڈاکٹرز، ۱۶۶۵۲ ڈنٹسٹ، ۹۴۷۶۶ نرسیں اور ہسپتالوں میں ۱۱۸۱۷۰ ،بستر ہیں۔ اگر انہیں تقریبا بیس کروڑ کی آبادی پر تقسیم کیا جائے تو ۱۰۳۸ افراد پر ایک ڈاکٹر، ۱۲۴۴۷ افراد پر ایک ڈنٹسٹ ۱۵۹۱ افراد کو ایک بستر میسر آتا ہے۔[۱]

خواتین کو چاہئے کہ وہ طب کے پیشے پر خصوصی توجہ دیں تاکہ طب کے تمام میادین میں عورتوں کا میڈیکل چیک اپ عورتیں ہی کر سکیں اس میں جہاں مریضوں کے لئے یہ فائدہ ہے کہ انہیں طبی معائنے کے لئے کسی نامحرم کے پاس نہ جانا پڑے گا وہیں خواتین ڈاکٹرز کے لئے یہ مواقع ہیں کہ وہ اپنے گھروں میں کلینک قائم کر سکتی ہیں۔ ایک اسلامی فلاحی ریاست کو قطعا یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ہر میدان زندگی میں عورت ومرد کو اکٹھا کر کے ایک ہی ساتھ بٹھادے۔ اس لئے ضروری ہے کہ جس طرح خواتین کے لئے الگ اسکول، کالجز اور جامعات ہیں اسی طرح ہسپتال بھی جدا ہوں۔ عزم اگر مصمم اور نیت اگر خالص ہو تو ایسا انتظام ناممکن نہیں بلکہ نصرتِ خداوندی کی بدولت نہایت آسان اور باعثِ رحمت ہے، لیکن دورِ حاضر میں جس طرح ہسپتالوں اور کلینکس میں خواتین ڈاکٹر اور نرسیں بے پردہ نظر آتی ہیں، اسلام اس لبرل ازم اور وسعت ذہنی یا روشن خیالی کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ ضرورت کے تحت ہر شے کی اجازت دیتا ہے مگر انسانیت کی خیر خواہی کے لئے اصول وضوابط بھی مقرر کرتا ہے جس سے اعراض کی گنجائش نہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ خواتین ڈاکٹر اور ان کا اسٹاف پردے کی لازمی پاسداری کرے اور مرد وزن کے اختلاط سے بچے۔

عورت بحیثیت معلمہ

اسلام وہ مذہب ہے کہ تعلیم وتحقیق اس کا نقطہ آغاز ہے۔ وہ گود سے گور تک طلبِ علم کا درس دیتا ہے اور عالم وجاہل میں علم کی بنیاد پر تفریق کر کے علماء کو اعلیٰ مناصب عطا کرتا ہے۔ دینِ اسلام علومِ دینیہ اور علومِ عصریہ کی تفریق کا قائل نہیں بلکہ وہ علوم کی تقسیم علومِ نافعہ وغیر نافعہ کی بنیاد پر کرتا ہے اور اس سلسلے میں مرد ہو یا عورت، ہر ایک کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ غزوہ بدر میں وہ کفار جو قیدی تھے، کا کفارہ دس دس بچوں کو تعلیم دینا قرار پایا۔ حضرت شفاء بنت عبد اللہ رضی اللہ عنہا کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جیسے تم نے حفصہ رضی اللہ عنہا کو کتابت سکھائی ہے تو کیا انہیں مرضِ نملہ کی دعا نہیں سکھاؤ گی؟۔[۲]

---

(۱) Economic Survey of Pakistan, 183

(۲) سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۳۸۸۷، ۴/ ۱۱

رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی کثرت ازواج میں اصحاب کی دلجوئی، عداوتوں کے خاتمے سمیت ایک حکمت یہ بھی تھی کہ ازواجِ مطہرات کو دینِ اسلام کی تعلیم دے کر انہیں دین سکھانے پر مامور کر دیا جائے تاکہ خواتین کے وہ مسائل جن کے بیان کرنے میں ایک مَرد کے لئے شرم وحیاء مانع ہوتی ہے، کا بہترین بندوبست ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ازواجِ مطہرات نے شوق ورغبت سے دین سیکھا اور پھر اسے امت تک بخوبی پہنچایا۔(۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی کل مرویات کی تعداد ۲۲۱۰ ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی مرویات کی تعداد ۳۷۸ ہے اور پنتیس سے زیادہ صحابہ و تابعین نے آپ سے احادیث نقل کی ہیں۔ آپ فقہ میں بھی نمایاں مقام رکھتی ہیں اور آپ کا شمار فقہاء صحابہ میں ہوتا ہے۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے ۶۰ احادیث منقول ہیں اور بارہ سے زیادہ افراد نے آپ سے روایات نقل کی ہیں۔ حضرت میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا نے ۴۶ جبکہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے ۶۵ احادیث، رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سے نقل کی ہیں۔(۲)

ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے تقریبا ایک ہزار روایات مروی ہیں جو انہوں نے نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سے روایت کی ہیں اور ستر کے قریب صحابیات ایسی ہیں جنہوں نے نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم اور صحابہ کرام سے روایات نقل کی ہیں اور بڑے ائمہ ان کے شاگرد ہیں۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ ور امام ابن قیم جوزیہ رحمۃ اللہ علیہ ایک مشہور عالمہ فخر النساء کے تلامذہ میں سے ہیں۔ علامہ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے ۸۱ اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ۷۱ عورتوں سے میراثِ نبوی کو حاصل کیا ہے۔(۳)

۲۰۱۳ تا ۲۰۱۶ کے معاشی سروے کے مطابق پاکستان کے چاروں صوبوں میں خواتین کی شرح خواندگی درج ذیل کے مطابق ہے جس سے یہ اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ خواتین کو تعلیم و تعلم کے میدان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے :(۴)

سال	پنجاب	سندھ	خیبر پختونخواہ	بلوچستان
۲۰۱۳_۲۰۱۴	۴۳فیصد ، ۷۱فیصد	۲۱فیصد ، ۶۳فیصد	۳۲فیصد ،۵۵فیصد	۱۷فیصد ،۴۵فیصد
۲۰۱۵_۲۰۱۶	۴۵فیصد ،۷۳فیصد	۲۴فیصد ،۷۰ فیصد	۳۱فیصد ، ۵۲فیصد	۱۷فیصد ،۴۲فیصد

(۱) ندوی، ڈاکٹر رضی الاسلام، حقائق الاسلام، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ص:۸۳

(۲) ندوی، ڈاکٹر رضی الاسلام، امہات المومنین اور فروغ علم (مضمون)، http://www.raziulislamnadvi.com/

(۳) عمل المرأۃ، ص:۱۷۶

(۵) Economic Survey of Pakistan,P.169

خواتین کے لئے تعلیم و تعلم کے میادین

دور حاضر میں خواتین کے لئے سب سے بہتر میدان طب اور درس و تدریس ہے جس میں آنے کے بعد بہترین افرادی قوت پاکستانی قوم کو میسر آسکتی ہے۔ایسے شعبے جہاں عورت کو ریسیپشن پر بٹھا کے اس حسن کو کیش کروایا جائے، مرد و عورت کے ایمان پر ڈاکہ ڈالنے کے مترادف ہے، لہٰذا خواتین کو ایسے شعبوں میں تعلیم اور ملازمت سے گریز کرنا چاہئے جہاں حیاء کا دامن تار تار ہوتا ہو اور بنت حوا، حوس کی نظروں کا نشانہ بنتی ہو۔

رضاعت

عہد رسالت میں رضاعت ایک جانا پہچانا پیشہ تھا اور بہت سی عورتیں اس پیشے سے وابستہ تھیں۔ قرآن حکیم نے ان مرضعات کو دستور کے مطابق معاوضہ دینے کا کہا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ﴾[1]

اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پائیں یہ (حکم) اس کے لیے ہے جو دودھ پلانے کی مدت کو پورا کرنا ہے اور جس کا بچہ ہے اس کے ذمہ دستور کے موافق ان (ماؤں) کا کھانا اور پہننا ہے۔

حلیمہ سعدیہ نے سرور دوعالم ﷺ کو دودھ پلایا تو ام بردہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کو دودھ پلایا۔ جب حضرت ابراہیم پیدا ہوئے تو انصار کی عورتوں میں یہ بات ہوئی کہ انہیں دودھ کون پلائے گا؟ تو نبی کریم ﷺ نے انہیں ام بردہ کے حوالے کر دیا۔[2] یوں ام بردہ کو حضرت ابراہیم کی رضاعت کا شرف حاصل ہوا۔ مرضعہ کا پیشہ آج بھی اپنانے میں کوئی حرج نہیں بالخصوص ان حالات میں جب خواتین میں ملازمتوں کا رجحان بڑھا ہے۔ پاکستان میں ۱۹۵ء۴ ملین آبادی میں ۶۱ء۴ ملین افراد باروزگار ہیں۔ جن میں بڑی تعداد بالخصوص شہروں میں خواتین کی بھی ہے۔ معاشی سروے کے مطابق ایک عورت کے حصے میں ۳ء۱ بچے آتے ہیں۔ ملازمت پیشہ خواتین چونکہ چھ سے آٹھ گھنٹے گھر سے باہر ہوتی ہیں اس لئے مرضعہ اور دایا کی ضرورت ایک ناگزیر امر ہے۔ خواتین اپنے گھروں میں ڈے کیئر سنٹر قائم کر کے جہاں ملازم خواتین ضرورت پوری کر سکتی ہیں، وہیں اپنے لئے روزگار کا بندوبست بھی امر بدیہی ہے۔ اس سے نہ گھر کا کام متاثر ہوتا ہے نہ ہی بے پردگی سے خلاف شریعت کچھ لازم آتا ہے۔ اگر اس میں خلوص نیت شامل ہو تو یہ ﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى﴾[3] کے مصداق عبادت ہی ہے۔

---

(۱) سورۃ البقرۃ:۲۳۳

(۲) طبقات ابن سعد، ۱/۱۰۸

(۳) سورۃ المائدۃ:۲

عورت بحیثیت خادمہ

بسا اوقات گھر کے کام کاج، کھانے پکانے اور صفائی ستھرائی وغیرہ کے لئے ملازم کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بعض اوقات مرد کی بجائے عورت بحیثیت خادمہ زیادہ مناسب رہتی ہے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے گھر میں ایک باندی کے چہرے پر داغ دیکھا تو فرمایا: اس کا علاج کرواؤ، اسے نظر لگ گئی ہے۔[1] ابن سوید کہتے ہیں کہ ہم بنی مقرن کے پاس صرف ایک ہی خدامہ تھی۔ ہم میں سے کسی نے اسے تھپڑ مارا تو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اسے آزاد کر دو۔ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تو بس وہ ایک ہی خادمہ ہے تو سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چلو ٹھیک ہے تم اسے خدامہ رکھو مگر جیسے ہی حالات بہتر ہوں تو اسے آزاد کر دینا۔[2] دورِ حاضر میں عورت کی ملازمت کے سبب گھریلو خدامہ شہروں میں ہر دوسرے کی ضرورت ہے۔ اگر ایک باصلاحیت عورت ملازمت سے معاشرے کو فائدہ پہنچا سکتی ہے تو آخر اس میں حرج کیا ہے کہ خدامہ کے ذریعے اس کے گھر کا بندوبست ہو جائے؟ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہمیں تلاشِ بسیار کے بعد بھی اچھی خدامہ میسر نہیں آتی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ خواتین جو یہ فریضہ سرانجام دینا چاہیں، گھریلو امور میں خوب تربیت یافتہ ہوں اور نہایت امانت و دیانت سے اپنے فریضہ کو سرانجام دیں۔ تاہم یہ بھی ضروری ہے کہ ان خادماؤں کو اپنی ملک نہ سمجھ لیا جائے اور نہ ہی ٹشو پیپر کہ جب چاہا لے لیا اور جب چاہا پھینک دیا بلکہ انہیں معاشرے میں قابلِ عزت مقام دیا جائے۔ حکومتِ وقت انہیں سوشل سیکیورٹی فراہم کرے اور جیسے اداروں کے مزدوروں کو علاج معالجہ اور دیگر سہولیات فراہم کی جاتی ہیں، ان کی رجسٹریشن کے بعد انہیں بھی سہولیات فراہم کی جائیں۔

عورت کی ملازمت کے اصول وضوابط

دینِ اسلام جو کہ دینِ فطرت ہے، مرد و عورت کو وہ تمام حقوق ادا کرتا ہے جس سے زندگی کا پہیہ بآسانی رواں دواں رہ سکے لیکن وہ اس کے ساتھ ساتھ اصول وضوابط کے اپنانے کا بھی حکم دیتا ہے جن میں مطمع نظر محض انسانیت کی خیر خواہی اور اس کی فلاح و بہبود ہے۔ ذیل میں ہم انہی اصول وضوابط کا تذکرہ اختصار کے ساتھ کر رہے ہیں:

پردے کی پاسداری

ہر مسلمان عورت پر لازم ہے کہ وہ پردے کا خاص خیال رکھے۔ یہ اس قدر اہم ہے کہ شریعت نے قریبی رشتہ داروں سے بھی پردے کا حکم دیا لہٰذا غیروں کے سامنے اس کی اجازت کس طرح ممکن ہے؟ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

(۱) صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۵۷۳۹، ۷/ ۱۳۲

(۲) احمد بن محمد بن حنبل، مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۳۷۰، مؤسسہ الرسالۃ، ۲۰۰۱، ۳۹/ ۱۵۰

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيبِهِنَّ﴾[1]

اے نبی کریم (ﷺ) آپ کہہ دیں اپنی بیویوں سے اور اپنی بیٹیوں سے اور مومنوں کی عورتوں کو کہ اپنے آپ کو چادروں سے ڈھانپ لیں۔

چادروں سے ڈھانپنا ایسا ہو کہ نسوانیت اور اس کی جاذبیت چھپ جائے اور اگر چادر اور پردہ ایسا ہو کہ نسوانیت مزید عیاں ہوتی ہو تو بے فائدہ ہے۔ آیت مذکورہ میں پردے کا مقصد عورتوں کو ایذاء سے بچانا اور فتنے کی روک تھام ہے لہٰذا اس مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر چہرے کا پردہ بھی ضروری ہے۔ مولانا عبد الرحمٰن کیلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"عورت کا چہرہ ہی وہ چیز ہے جو مرد کے لئے عورت کے تمام بدن سے زیادہ پر کشش ہوتا ہے۔ اگر اسے ہی حجاب سے مستثنیٰ قرار دیا جائے تو حجاب کے باقی احکام بے سود ہیں۔ فرض کیجئے آپ اپنی شادی سے پہلے اپنی ہونے والی بیوی کی شکل و صورت دیکھنا چاہتے ہیں۔ اب اگر آپ کو اس لڑکی کا چہرہ نہ دکھایا جائے باقی تمام بدن ہاتھ، پاؤں وغیرہ دکھا دیئے جائیں تو کیا آپ مطمئن ہو جائیں گے؟ اس سوال کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ آپ کو اس لڑکی کا صرف چہرہ دکھا دیا جائے اور باقی بدن نہ دکھایا جائے اس صورت میں آپ پھر بھی بہت حد تک مطمئن نظر آئیں گے۔ پھر جب یہ سب چیزیں روزمرہ کے تجربہ اور مشاہدہ میں آرہی ہیں تو پھر آخر چہرہ کو احکام حجاب سے کیونکر خارج کیا جاسکتا ہے"[2]

لہٰذا ضروری ہے کہ ملازمت پیشہ خواتین پردے میں چہرے کے ڈھانپنے کا التزام کریں۔

مردوں سے عدم اختلاط

عورتوں کے لئے یہ بھی رہنمائی ہے کہ جب انہیں معاشی سرگرمیوں کے لئے کسی ایسی جگہ جانا پڑے جہاں مردوں سے اختلاط لازم آتا ہو تو ان پر لازم ہے کہ مردوں کے مابین مردوں سے عدم اختلاط کا رویہ رکھیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کوئی عورت کسی مرد کے ساتھ خلوت میں نہ بیٹھے[3]۔ قرآن کریم نے ہدایت کی

---

(۱) سورۃ الاحزاب:۵۹

(۲) کیلانی، مولانا عبد الرحمٰن، تیسیر القرآن، مکتبۃ السلام، لاہور، ۳/۶۱۱

(۳) صحیح بخاری، حدیث نمبر:۳۰۰۶، ۴/۵۹، صحیح مسلم، حدیث نمبر:۱۳۴۱، ۲/۹۷۸

ہے کہ اگر تمھیں عورتوں سے کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگو[۱]۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹیاں ایسے کنوئیں پر جمع ہیں جہاں مرد اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں لیکن وہ ایک جانب کھڑی ہیں اور کہتی ہیں:

﴿ حَتَّى يُصْدِرَ الرِّعَاءُ ﴾[۲]

کہ یہ چرواہے اپنے جانوروں کو پانی پلالیں تو ہم اپنی بکریوں کو پانی پلائیں گی۔

جب تک عورت عدم اختلاط کا رویہ برقرار رکھے گی، مخلوط نظام میں بھی اپنی شناخت برقرار رکھے گی، شیطانی وساوس سے بھی محفوظ رہے گی اور مردوں کو بھی اجازت نہ دے گی کہ ان کے دلوں میں کوئی مرض ہو۔ عورت کے قول و فعل میں سنجیدگی، چہرے پر معمولی سی ناگواری کے آثار اور آواز میں ذراسی کرخنگی جو بے ادبی وبد تمیزی کو بالکل بھی نہ پہنچے، حکم قرآنی ہے۔

قرآن کریم کی ہدایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر عورتوں کو معاشی سلسلے میں کہیں جانا پڑے تو اکیلی نہ جائیں بلکہ دو دو کی صورت میں جائیں اس لئے کہ اس میں شیطانی وساوس سے محافظت ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کے قصے میں یہ بھی ممکن تھا کہ ان کی ایک بیٹی جانوروں کو پانی پلاتی اور ان کے چارے کا بندوبست کرتی اور دوسری حضرت شعیب علیہ السلام کی تیمارداری کے لئے گھر ٹھہرتی، امور خانہ داری بجالاتی لیکن نص، قرآنی ہماری یہ رہنمائی کرتی ہے کہ وہ دونوں مل کر جانوروں کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔

خاوند کی اجازت

دینِ اسلام عورت کو معاشی سرگرمی کی اجازت دیتا ہے مگر وہ اسے خاندان کے سربراہ کی اجازت سے بھی مشروط کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ کوئی عورت اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر گھر سے نہ نکلے، اگر اس نے ایسا کیا تو اس پر آسمان کے فرشتوں اور عذاب دینے والے فرشتوں کی لعنت اس وقت تک برستی ہے جب تک وہ اپنے گھر نہ لوٹ آئے۔[۳]

شرم وحیاء کی پاسداری

شرم وحیاء ایک مومن کا جوہر ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حیاء ایمان کا ایک حصہ ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا کہ حیاء کا نتیجہ خیر ہی خیر ہے۔ بناتِ شعیب علیہ السلام کا معاملہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معاملہ بھی سَر تاپا حیاء ہی حیاء ہے جس میں قرآن کریم ﴿ تَمْشِي عَلَى اسْتِحْيَاءٍ ﴾ کے ذریعے بناتِ شعیب کی وکالت کرتا ہے لہذا ایسی ملازمت جس میں شرم وحیاء کی پاسداری نہ رہے، عوتوں کے لئے جائز نہیں۔

---

(۱) سورۃ الاحزاب:۵۳

(۲) سورۃ القصص:۲۳

(۳) بیہقی، احمد بن حسین بن علی، سنن الکبریٰ، حدیث نمبر:۱۳۱۷۱۴، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۳ء، ۷/۷۷۴

نتائج و سفارشات

۱۔ عورت کی اولین ذمہ داری امورِ خانہ داری اور اہل و عیال کی دیکھ بھال ہے تاہم معاشی تگ و دو میں حصہ لینے کی بھی اجازت ہے لہٰذا وہ خواتین جنہیں اپنے ذمہ داران کی طرف سے ملازمت کی اجازت ہو، وہ کسبِ معاش میں حصہ لے سکتی ہیں اور بصورتِ دیگر انہیں گھروں میں ہی قیام کرنا چاہئے۔

۲۔ خواتین کی فطری ساخت کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کے لئے تعلیم اور ملازمت کے میادین خاص کئے جائیں۔

۳۔ خواتین کو باہنر بنانے کے ساتھ ساتھ ان کے لئے معاشی سرگرمیوں کا بھی بندوبست کیا جائے اور پہلے سے باروزگار خواتین کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

۴۔ مزدور پیشہ خواتین کو باقاعدہ رجسٹرڈ کرنے کے ساتھ لیبر قوانین کے تحت انہیں مکمل تحفظ فراہم کیا جائے۔

۵۔ وطنِ عزیز کے اداروں میں مرد و زن کے اختلاط کے سبب معاشرت برائیاں جنم لے رہی ہیں جن کا سدِباب نہایت ضروری ہے۔ بہت ضروری ہے کہ مرد و خواتین کے الگ الگ ادارے تشکیل دیئے جائیں جہاں شرعی امور کی پاسداری کرتے ہوئے افرادی قوت کو کام میں لایا جاسکے۔

۶۔ باروزگار خواتین میں باقاعدہ پالیسی کے تحت امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا اہتمام کیا جائے تاکہ اخلاق زیادہ سے زیادہ محفوظ رہیں۔

***

فتح مکہ میں آنحضرت ﷺ کی حربی حکمت عملی

War Strategy of The Holy Prophet (ﷺ) in the Conquest of Makkah

طاہرہ بتول *
ڈاکٹر عبد الغفار بخاری **

ABSTRACT

This article encompassed the Holy Prophet's (ﷺ) best war strategy in the conquest of Makkah and its relevance to the Modern society. The purpose of this article was to highlight the war strategy of Holy Prophet (ﷺ) in the conquest of Makkah. His strategy provided the noble example for warfare in modern world. The method used for research was historical. The review of literature revealed that the war strategies of Prophet Muhammad (ﷺ) showed the love for humanity, concern for the safety of the lives and avoided bloodshed as far as possible. Because of his noble strategies, Makkan tribes surrendered without any resistance in front of the army of Islam. Consequently, Makkah became freed from idolatry and the Holy Prophet (ﷺ) conquered the last and the most solid stronghold of the enemy. In Modern era, Muslim faced so many war problems. Through the war strategies of Holy Prophet (ﷺ), military commanders can learn the war ethics and overcome their problems. It is recommended to Muslim army that they should take guidance from the war strategy of Prophet Muhammad (ﷺ) and defeat enemy by putting psychological pressure upon them.

Keywords: *Prophet Muhammad (ﷺ), Qurayish, Muslim, The Conquest of Makkah, Modern world.*

* پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ علوم اسلامیہ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد
** صدر شعبہ علوم اسلامیہ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جنگی حکمت عملی سے مراد دشمن کے مقابلے میں فتح کو یقینی بنانے اور شکست کے اسباب کو کلیتًا ختم کرنے کے لئے اقتصادی، نفسیاتی اور خالص فوجی بنیادوں پر وضع کی گئی ایسی منصوبہ بندی اور طریقہ کار ہے جو حالتِ خوف و امن ہر دو حالتوں میں قابل عمل ہو۔(۱)

آنحضرت ﷺ رحمۃ للعالمین ہونے کے ساتھ ساتھ حکمت کے منبع بھی تھے۔ ہر جنگ میں آپ ﷺ کی جنگی حکمت عملی بہترین اور بے مثال ہوتی تھی۔ آپ ﷺ کی فتح کا راز شخصی شجاعت، بے مثال اعصابی قوت اور حربی مہارت تھی۔ آپ ﷺ نے میدان جنگ میں انتہائی منصوبہ بندی، حکمت عملیوں اور بہترین حربی صلاحیتوں سے دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ آپ ﷺ نے جنگوں میں دشمن کیخلاف جس بہادری کا مظاہرہ کیا تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ آپ ﷺ نے تلوار صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور دین اسلام کی ترویج و اشاعت کیلئے اٹھائی۔

آپ ﷺ کی حربی زندگی میں بہترین حکمت عملیاں وہ ہیں جو آپ ﷺ نے مکہ فتح کرنے کے لئے اختیار کیں۔ فتح مکہ میں آپ ﷺ نے اپنی عسکری طاقت کو اتنا مضبوط کر دیا کہ دشمن ہیبت سے اس قدر مرعوب ہوئے کہ ہتھیار اٹھانے کی جرأت نہ کر سکے۔ آپ ﷺ کی بہترین حربی حکمت عملیوں اور تدابیر نے ہی اہل مکہ کو بغیر کسی خون ریزی کے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور کر دیا۔ یہ تاریخ اسلامی کا پہلا واقعہ ہے جس میں مکہ کے اندر دس ہزار مجاہد حضرت محمد ﷺ کی قیادت میں بھرپور عسکری تیاری کے ساتھ داخل ہوتے ہیں اور وہ بغیر کسی بڑے نقصان کے فتح حاصل کرتے ہیں۔ مکہ کو فتح کرنے کے بعد آپ ﷺ اپنے بدترین دشمنوں کے لئے عام معافی کا اعلان کرتے ہیں۔ فتح مکہ میں آپ ﷺ کا حربی کردار ہر لحاظ سے برتر، امن پسند، خون ریزی سے نفرت، دور اندیش، محتاط اور انسان کے خیر خواہ کے طور پر نظر آئے گا۔

فتح مکہ کا پس منظر

حدیبیہ کے مقام پر قریش مکہ اور مسلمانوں کے درمیان دس سال کے لئے صلح کا معاہدہ طے پایا۔ اس کی دیگر شرائط کے علاوہ ایک شرط یہ تھی کہ عرب کے دیگر قبائل کو اجازت دی گئی کہ وہ جس فریق کے ساتھ چاہیں دوستی کا معاہدہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ بنو بکر نے قریش کے ساتھ اور بنو خزاعہ نے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کر لیا۔ بنو بکر اور بنو خزاعہ کے درمیان پرانی دشمنی چلی آرہی تھی۔ بنو بکر نے بنو خزاعہ سے اپنا بدلہ لینے کے لئے ان پر رات کے وقت حملہ کیا اور ان کے کئی آدمی مار دیئے۔(۲) اس طرح صلح حدیبیہ کے بائیس مہینے بعد قریش نے معاہدے کی خلاف ورزی کر دی۔ اس زیادتی کے بعد بنی خزاعہ کے لوگ آپ ﷺ کے پاس مدینہ میں فریاد لے کر

---

(۱) A Dictionary of US Military Term, (Washington DC: Public Affair Press), 205

(۲) ابن ہشام، ابو محمد عبد الملک، سیرۃ ابن ہشام، دار الصحابہ، التراث، طنطا، مصر، طبع اول:۱۹۹۵ء، ۴/۵

پہنچے۔ آپ ﷺ نے ان سے مدد کا وعدہ کیا۔[۱] آپ ﷺ نے اپنے قاصد کو مکہ والوں کی طرف روانہ کیا اور تین شرطیں پیش فرمائیں کہ ان میں سے کوئی ایک شرط قریش قبول کر لیں۔ قریش مکہ نے حدیبیہ کا معاہدہ توڑنے والی شرط مان لی ۔ قاصد کے چلے جانے کے بعد قریش مکہ کو اپنے عمل پر ندامت ہوئی اور وہ اپنی غلطی پر خوف زدہ ہوئے۔ قریش مکہ نے معاہدے کی تجدید کے لئے حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ کے پاس مدینہ بھیجا۔ مگر آپ ﷺ نے ان کی درخواست کو قبول نہیں کیا۔[۲]

آپ ﷺ نے ابوسفیان کے مکہ جانے کے بعد رازداری کے ساتھ جنگ کی تیاری شروع کر دی اور فوج کی روانگی قریش سے پوشیدہ رکھی۔ اس لیے آپ ﷺ چاہتے تھے کہ مکہ والوں کو آپ ﷺ کی آمد کا پتہ نہ چلے اور آپ ﷺ اچانک ان پر حملہ کر دیں۔

آپ ﷺ دس رمضان المبارک آٹھ ہجری کو اپنے دس ہزار سپاہیوں[۳] کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوئے، نامعلوم اور غیر معروف راستوں سے گزرتے ہوئے فوراً مر الظہران[۴] کے مقام پر پہنچ گئے اور اپنی فوج کے ہر سپاہی کو الگ الگ آگ روشن کرنے کا حکم دیا۔ اس طرح آگ سے تمام صحرا روشن ہو گیا۔[۵] قریش کو رات کے وقت آگ کی روشنی سے پتا چلا کہ کوئی لشکر ان کے سر پر پہنچ چکا ہے۔ انہوں نے حضرت ابو سفیان بن حرب اور حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ[۶] کو خبریں معلوم کرنے کے لئے روانہ کیا، راستے میں انہیں بدیل بن ورقاء رضی اللہ عنہ[۷] بھی مل گئے۔ جب یہ تینوں مر الظہران کے قریب پہنچے تو انہوں نے میلوں تک آگ ہی آگ دیکھی۔[۸] یہ منظر دیکھ کر یہ

---

(۱) سیرۃ ابن ہشام، ۴/ ۱۰

(۲) مبارکپوری، صفی الرحمن، الرحیق المختوم، ادارہ الشؤون الاسلامیہ، قطر، ۲۰۰۷ء، ص:۳۹۶

(۳) بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، باب غزوۃ الفتح فی رمضان، حدیث نمبر :۴۲۷۶، محقق: محمد زہیر بن ناصر الناصر، دار طوق النجاۃ، طبع اول:۱۴۲۲ھ، ۵/ ۱۴۶

(۴) مر الظہران: مکہ کے نواح میں واقع ہے۔ مر الظہران اور بیت اللہ کے درمیان سولہ میل کا فاصلہ ہے (ابوعبید البکری، معجم ما استعجم، ادارۃ الثقافۃ من جامعۃ الدول العربیۃ، قسطنطینیہ، ۱۹۴۹ء، ۱/ ۳۲۹)

(۵) سیرۃ ابن ہشام، ۲۱/۴

(۶) حکیم بن حزام: آپ کا تعلق قریش سے تھا، کنیت ابو خالد تھی۔ آپ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے۔ ایک سو بیس برس زندہ رہے۔ ۵۴ ہجری میں وفات پائی (ابن الاثیر، ابوالحسن علی بن ابی الکرم محمد، اسد الغابۃ، دار الکتب العلمیہ، بیروت، طبع اول:۱۴۱۵ھ، ۲/ ۳۵۸)

(۷) بدیل بن ورقاء رضی اللہ عنہ: آپ کا تعلق بنو خزاعہ سے تھا۔ آپ صحابی تھے اور مکہ کے رہنے والے تھے۔ فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کیا تھا (ابن حجر عسقلانی، احمد بن علی بن حجر، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، تحقیق: علی محمد البجاوی، دار الجیل، بیروت، ۱۹۹۲ء، ۱/ ۲۷۵)

(۸) صحیح بخاری، حدیث نمبر :۴۲۸۰، ۵/ ۱۴۶

تینوں پریشان ہوگئے اور وہ آپس میں لشکر کے بارے میں قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ان کی آوازیں پہچان لیں اور انہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لشکر کے بارے میں بتایا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں امان طلب کرنے کے لئے لے گئے۔ حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کر لیا۔[۱] اسلامی لشکر کو مکہ کی طرف پیش قدمی کا حکم دینے سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ والوں کے لئے امان کے مقام مقرر کیے۔[۲]

بیس رمضان آٹھ ہجری ذی طوی[۳] کے مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر کی تقسیم و ترتیب فرمائی اور لشکر کو چار حصوں میں تقسیم فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سالاروں کو مکہ میں ہتھیار استعمال کرنے سے منع کیا اور سوائے چند لوگوں کے کسی شخص کو بھی قتل نہ کرنے کا حکم دیا۔[۴] خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی فوج کے سوا تمام لشکر بغیر مزاحمت کے شہر میں داخل ہوئے۔ خالد بن الولید رضی اللہ عنہ کو خندمہ[۵] کے مقام پر قریش کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور دونوں فوجوں کے درمیان لڑائی ہوئی۔ قریش کو شکست ہوئی اور یہ لوگ بھاگ گئے۔ اس لڑائی میں دو مسلمان شہید ہوئے[۶]۔ مشرکین کے بارہ یا تیرہ آدمی مارے گئے[۷]۔ بیس رمضان آٹھ ہجری کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ فتح کر لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سورہ فتح کی تلاوت کرتے ہوئے مسجد حرام کے اندر داخل ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجر اسود کو بوسہ دیا اور بیت اللہ کا طواف کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کو بتوں سے پاک کرنے کے بعد خانہ کعبہ میں موجود حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی تصویروں کو مٹا دیا اور نماز ادا فرمائی۔[۸] پھر اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ کو ایک بلیغ خطبہ دیا، جس میں بہت سے شرعی احکام، اخلاقی نصیحتیں، امورِ جاہلیت کا خاتمہ اور اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد کی زندگی میں فرق کو بیان کیا۔[۹] خطبے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سوائے گیارہ مردوں اور چار عورتوں کے سب لوگوں

---

(۱) سیرۃ ابن ہشام، ۴/ ۲۲

(۲) قشیری، مسلم بن الحجاج، صحیح مسلم، باب فتح مکہ، حدیث نمبر:۸۶، تحقیق: محمد فواد عبد الباقی، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۳/ ۱۴۰۷

(۳) ذی طوی: مکہ کے ایک علاقے کا نام ہے جو حرم کی حدود میں واقع ہے (نعمانی، محمد بن ابراہیم، الغیبہ، نشر صدوق، تہران، ۱۳۹۷ھ، ص:۱۸۲)

(۴) سیرۃ ابن ہشام، ۴/ ۳

(۵) خندمہ: مکہ معظمہ کا ایک پہاڑ ہے (معجم ما استعجم، ۱/ ۱۴۶)

(۶) صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۴۲۸۰، ۵/ ۱۴۶

(۷) سیرۃ ابن ہشام، ۴/ ۲۸

(۸) الرحیق المختوم، ص: ۴۰۴

(۹) سیرۃ ابن ہشام، ۴/ ۳۴

کو معاف کر دیا۔[۱] فتح مکہ سے مکہ والوں پر حق واضح ہو گیا۔ وہ اس حقیقت کو جان گئے کہ اسلام کے سوا کوئی کامیابی کی راہ نہیں۔ اس لیے وہ اسلام لانے کے لئے آپ ﷺ کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کے لئے جمع ہو گئے۔ آپ ﷺ نے کوہ صفا پر چڑھ کر ان سے بیعت لی۔ آپ ﷺ نے مکہ میں پندرہ[۲] یا انیس[۳] دن قیام کیا۔ آپ ﷺ نے مکہ کا نظم و نسق اور انتظام چلانے کے لئے حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ[۴] کو مکہ کا عامل بنایا جو لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو نو مسلموں کو مسائل و احکام اسلام کی تعلیم دینے کے لئے مامور فرمایا۔[۵]

یہ ایک ایسی عظیم الشان فتح تھی جس نے لوگوں کو اسلام کے قریب کر دیا اور اس فتح کے بعد عرب کے دینی اور سیاسی میدان میں مسلمانوں کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد عرب کے قبائل کے لوگ قریش کے بجائے مسلمانوں کو عرب کی سب سے بڑی سیاسی اور مذہبی طاقت سمجھنے لگے اور وہ آپ ﷺ کی قیادت میں ایک قوم بن گئے۔

فتح مکہ میں آنحضرت ﷺ کی حربی حکمت عملی

میدانِ جنگ میں اترنے سے پہلے ایک کامیاب سپہ سالار ایسی حکمت عملی اپناتا ہے جس سے کم وسائل کے ساتھ مطلوبہ نتائج حاصل ہو سکیں۔ اگر جنگی حکمت عملی معیاری نہ ہو تو سپہ سالار کے اوصاف و کمالات اور فوج کی بہترین تربیت بے اثر ہو جاتی ہے۔ جنگی حکمت عملی سے ہی سپہ سالار کی صلاحیتیں اور فوج کی قوت کھل کر سامنے آتی ہے اور ان کو نتیجہ خیز بناتی ہے۔ بعض اوقات اعلیٰ ترین حکمت عملی فوج کی بڑی بڑی غلطیوں کو چھپا دیتی ہے اور اسی جنگی حکمت عملی سے وہ کامیاب ہوتے ہیں۔ آپ ﷺ کی ہر جنگ میں حربی حکمت عملی ہر طرح سے بہترین اور بے مثل ہوا کرتی تھی۔ آپ ﷺ نے جتنی لڑائیاں لڑیں، ان میں آپ ﷺ نے شرکت سے پہلے اپنے محدود وسائل کے ساتھ بھرپور انتظامات کیے اور جنگوں کی ایسی منصوبہ بندی کی کہ قلت کے باوجود کثرت پر فتح حاصل کر لی۔ فتح مکہ میں آپ ﷺ نے جو حربی حکمت عملی اور تدابیر اختیار کیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

---

(۱) سیرۃ ابن ہشام، ۴/۳۰

(۲) ایضا، ۴/۳۰

(۳) صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۴۲۹۹، ۵/۱۵۰

(۴) حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ: آپ کا تعلق قریش سے تھا۔ کنیت بعض کے نزدیک ابو عبد الرحمن اور بعض کے نزدیک ابو محمد تھی۔ فتح مکہ کے واقعہ میں اسلام قبول کیا اور حضور اکرم ﷺ نے آپ کو مکہ کا عامل بنا دیا۔ حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں بھی والی مکہ کے منصب پر برقرار رہے اور جس دن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی اسی دن حضرت عتاب رضی اللہ عنہ نے بھی اس دار فانی کو کوچ کیا (اسد الغابۃ، ۲/۲۳۸)

(۵) ابن سعد، ابو عبد اللہ محمد، الطبقات الکبری، دار صادر، بیروت، ۱۹۶۸، ۲/۱۳۷

رازداری

جنگ میں کامیابی کے حصول کے لئے رازداری کے اصول کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ عصر حاضر میں ہر ملک کو اپنے ارادوں کے بارے میں رازداری کا خاص انتظام کرنا چاہیئے، کیونکہ اپنے ارادے کو خفیہ رکھنے کی وجہ سے ہی ان کے مخالفین تک ان کے ارادوں کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے تک کوئی خبر نہیں پہنچ سکے گی۔

عبد الرحمن کیلانی رحمۃ اللہ علیہ[۱] رازداری کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"رازداری کی اہمیت یہ ہے کہ بعض دفعہ محض ایک راز لیک آؤٹ ہو جانے سے جنگ کا نقشہ ہی بدل سکتا ہے اور لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔"[۲]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ سو سال پہلے اس اصول کو اپنایا۔ فتح مکہ میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رازداری کا خاص اہتمام کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ میں تمام امور کو مکمل طور پر خفیہ رکھا اور ساری کاروائی رازداری سے مکمل کی تاکہ دشمن متوقع کاروائی کا بروقت توڑ تیار نہ کرلے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی وعدہ خلافی کی وجہ سے مکہ کی طرف جانے کا ارادہ کیا تو اس چیز کا خاص خیال رکھا کہ کسی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادے کا علم نہ ہو سکے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے لئے سامان تیار کرنے کا حکم دیا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کو بھی اس بات کا علم نہیں تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ کس طرف جانے کا ہے۔ اس چیز کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامان کی تیاری کر رہیں تھیں تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ آئے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کے بارے میں پوچھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے انہیں یہ جواب دیا:

«وَاللهِ مَا أَدْرِي»[۳]

اللہ کی قسم مجھے یہ معلوم نہیں ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے لاعلمی اس لئے ظاہر کی کیونکہ وہ خود اس بات سے بے خبر تھیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کن کے ساتھ جنگ کرنے کا ارادہ کیا ہوا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے مکہ کی طرف نکلتے وقت یہ دعا فرمائی:

«اللّٰهُمّ خُذْ عَلَى قُرَيْشٍ الْأَخْبَارَ وَالْعُيُونَ حَتّى نَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً»[۴]

---

(۱) عبد الرحمن کیلانی: آپ ۱۱ نومبر ۱۹۲۳ء کو ضلع گوجرانوالہ کے علاقہ کیلیانوالہ میں پیدا ہوئے۔ آپ عالم دین اور مصنف تھے۔ آپ ۱۸ دسمبر ۱۹۹۵ء کو فوت ہوئے (سعید، عاکف، مولانا عبد الرحمن کیلانی، اردو چوپال فورم، ۳ ستمبر ۲۰۱۰ء)

(۲) عبد الرحمن کیلانی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت سپہ سالار، مکتبہ السلام، لاہور، جون ۲۰۱۰ء، ص: ۵۲

(۳) طبرانی، سلیمان بن احمد، المعجم الصغیر، تحقیق: محمد شکور محمود الحاج، المکتب الاسلامی، دار عمار، بیروت، طبع اول: ۱۹۸۵ء، ۱۶۸/۲

(۴) واقدی، ابو عبد اللہ محمد بن عمر بن واقد، المغازی، تحقیق: مارسدن جونس، عالم الکتب، بیروت، ۷۹۶/۲

اے باری تعالیٰ! آنکھوں اور خبروں کو قریش سے پکڑ لے یعنی نہ قریش کو ہماری تیاری کی خبر ہو اور نہ ہماری تیاری کو دیکھ سکیں۔

رسول اکرم ﷺ نے یہ الفاظ اس لئے ادا فرمائے کیونکہ آپ ﷺ چاہتے تھے کہ آپ ﷺ کی مکہ کی طرف روانگی کی خبر قریش مکہ کو نہ ملے اور آپ ﷺ مکہ کو بغیر خونریزی کے فتح کر لیں۔

رسول اکرم ﷺ کی رازداری کا یہ عالم تھا کہ آپ ﷺ نے بارہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم [۱] کو اپنے حلیف قبائل کی طرف جنگ کی تیاری کی اطلاع دینے کے لئے روانہ فرمایا۔ [۲]

آپ ﷺ نے اپنے حلیف قبائل کی طرف اتنی رازداری سے اپنے خفیہ پیغامات بھیجے کہ دوسرے مسلمانوں کو بھی اس کی خبر نہیں تھی۔ آپ ﷺ نے اپنے حلیف قبائل کو یہ نہیں بتایا کہ کن کے ساتھ جنگ کرنے کا ارادہ ہے، اور ساتھ ہی انھیں راستے میں اپنے ساتھ شامل ہونے کا حکم دیا۔ آپ ﷺ نے راستوں کی نگرانی کا کام حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سپرد کیا، جنہوں نے مدینہ کے آس پاس اور مکہ کے راستے میں اپنے محافظ کھڑے کر دیئے۔ محافظ کسی بھی مشکوک آدمی کو مکہ کی طرف سفر نہیں کرنے دیتے تھے۔ اس وجہ سے قریشِ مکہ کو آپ ﷺ کی نقل وحرکت کا علم نہ ہو سکا۔ [۳]

آپ ﷺ نے مکہ کی طرف جانے کا پروگرام اتنا خفیہ رکھا کہ کسی کو اس کا پتا ہی نہ چل سکا۔ حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ [۴] نے رسول اکرم ﷺ کی مکہ آمد کی اطلاع ایک عورت کے ذریعے قریش کو بھیج دی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت مقداد رضی اللہ عنہ [۵]، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ [۶] کی مؤثر ناکہ بندی کے ذریعے وہ عورت راستے میں پکڑی گئی۔ [۷]

---

(۱) اسماء بن حارثہ رضی اللہ عنہ، ہند بن حارثہ رضی اللہ عنہ، رافع بن مکیث الجہینی رضی اللہ عنہ، جندب بن مکیث الجہینی رضی اللہ عنہ، ایماء بن رحضہ رضی اللہ عنہ، ابو ہم کلثوم الحصین رضی اللہ عنہ، معقل بن سنان رضی اللہ عنہ، نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ، بلال بن حارث رضی اللہ عنہ، عبد اللہ بن عمرو المزنی رضی اللہ عنہ، حجاج بن علاط اسلمی رضی اللہ عنہ اور عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ

(۲) المغازی، ۲/ ۸۰۰

(۳) باشمیل، محمد احمد، اسلام کے فیصلہ کن معرکے فتح مکہ، مترجم: اختر پوری، نفیس اکیڈمی، کراچی، دسمبر ۱۹۸۴ء، ص/ ۱۳۶

(۴) حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ: آپ بنی اسد کے حلیف تھے۔ آپ کا تعلق بنی خالفہ سے تھا اور وفات تیس ہجری میں ہوئی۔ اس وقت ان کی عمر پینسٹھ سال تھی۔ (اسد الغابۃ، ۱/ ۲۲۹)

(۵) حضرت مقداد رضی اللہ عنہ : آپ کے باپ کا نام عمرو بن ثعلبہ تھا، کنیت ابو الاسود تھی اور بعض کے مطابق ابو عمر یا ابو سعید تھی۔ آپ قدیم الاسلام تھے۔ ۳۳ھ میں انتقال ہوا۔ (الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ۷/ ۲۰۳)

(۶) حضرت ابو مرثد غنوی رضی اللہ عنہ: آپ کے نام کے بارے میں مختلف آراء ہیں۔ بعض کے نزدیک کناز بن الحصین اور بعض کے نزدیک حصین بن کناز اور بعض کے نزدیک ایمن تھا۔ آپ شام کے رہنے والے تھے۔ غزرہ بدر میں شریک ہوئے۔ (الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ۷/ ۳۶۹)

(۷) صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۴۲۷۴، ۵/ ۱۴۵

نبی اکرم ﷺ نے مکہ کی طرف اپنی روانگی کی خبر کو قریش سے پوشیدہ رکھنے کے لئے ایک اور اقدام کیا کہ رمضان آٹھ ہجری کے شروع میں بطن اضم [۱] کی طرف ابو قتادہ ربعی رضی اللہ عنہ [۲] کے زیر قیادت ایک سریہ روانہ کیا۔ ان کو بھیجنے کا مقصد یہ تھا کہ لوگ یہ گمان کریں کہ آپ ﷺ مکہ کے بجائے اس علاقے کی طرف رخ کریں گے۔ اس کے بارے میں صفی الرحمن مبارکپوری لکھتے ہیں:

"وزيادة في الإخفاء والتعمية بعث رسول الله ﷺ سرية قوامها ثمانية رجال، تحت قيادة أبي قتادة بن رِبْعِي، إلى بطن إضَم، فيما بين ذي خَشَب وذي المروة، على ثلاثة بُرُد من المدينة، في أول شهر رمضان سنة ٨ هـ ؛ ليظن الظان أنه ﷺ يتوجه إلى تلك الناحية، ولتذهب بذلك الأخبار" [۳]

پھر کمال اخفاء اور رازداری کی غرض سے رسول اللہ ﷺ نے شروع ماہ رمضان آٹھ ہجری میں حضرت ابو قتادہ بن ربعی رضی اللہ عنہ کی قیادت میں آٹھ آدمیوں کا ایک سریہ بطن اضم کی طرف روانہ کیا، یہ مقام ذی خشب اور ذی المروۃ کے درمیان مدینہ سے تقریباً چھتیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ سمجھنے والے سمجھیں کہ آپ ﷺ اسی علاقے کا رخ کریں گے اور یہی خبریں ادھر ادھر پھیلیں۔

قریش سے مکہ کی طرف اپنی آمد کو خفیہ رکھنے کے لئے آپ ﷺ لشکر کے ساتھ مدینہ سے مکہ کی طرف جنوب جانے کے بجائے شمال کی جانب روانہ ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ ﷺ شام کی طرف حملہ کرنے جارہے ہیں۔ راستے میں آپ ﷺ اپنے حلیف قبائل کو ساتھ لے کر سمت بدلتے بدلتے اور غیر معروف اور نامعلوم راستوں سے ہوتے ہوئے مکہ کے قریب پہنچ گئے۔ آپ ﷺ دس ہزار کا لشکر لے کر نہایت رازداری سے مر الظہران کے مقام تک پہنچ گئے [۴] اور قریش کو اسلامی لشکر کی روانگی کا علم ہی نہ ہو سکا۔

موجودہ دور میں رازداری کا انتظام کرنا ہر ملک کے لئے ضروری ہو گیا ہے۔ جس طرح آپ ﷺ نے فتح مکہ میں اپنے منصوبوں کو مخفی رکھا اور ہر مرحلہ پر مکمل رازداری سے کام لیا۔ اسی طرح ہر سپہ سالار کو رازداری کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔

---

(۱) بطن اضم: یہ مقام ذی خشب اور ذی المروہ کے درمیان مدینہ سے تقریباً ۲۳ میل کے فاصلے پر واقع ہے (الرحیق المختوم، ص:۳۹۷)

(۲) ابو قتادہ ربعی رضی اللہ عنہ: آپ کا نام بعض کے نزدیک حارث، بعض کے نزدیک نعمان اور بعض کے نزدیک عمرو تھا۔ احد اور بعد کے غزوات میں شریک ہوئے۔ آپ رضی اللہ عنہ کو نبی اکرم ﷺ کا شہسوار کہا جاتا تھا۔ ۵۴ھ میں وفات پائی اور اس وقت آپ کی عمر ۷۲ سال تھی۔ (الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ۷/۳۲۷۔۳۲۹)

(۳) الرحیق المختوم، ص:۳۹۷

(۴) ابن کثیر، ابو الفداء عماد الدین اسماعیل بن عمر، البدایہ والنہایہ، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۴/۲۸۸۔۲۸۴

معلومات کا حصول

جنگ میں ایک سپہ سالار کی بہترین حربی حکمتِ عملی یہ ہونی چاہیئے کہ اسے دشمن کی نقل و حرکت، تعداد اور ارادوں کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہو۔ کوئی بھی ملک خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا، اسے دشمن سے باخبر اور چوکنا رہنا پڑتا ہے اور اس کام کیلئے ضروری ہوتا ہے کہ دشمن کے ہر کام سے باخبر رہا جائے کیونکہ دشمن کی جنگی صلاحیت سے باخبر ہو کر اور اپنی قوت میں اضافہ کی بدولت دشمن ملک کے خطرناک عزائم کو ناکام بنایا جا سکتا ہے اور انہیں آسانی سے شکست دی جا سکتی ہے۔ ہر ملک کو کوشش کرنی چاہیے کہ ان کا دشمن ان کے حالات اور نقل و حرکت سے بے خبر رہے۔ عبدالرحمن کیلانی رحمۃ اللہ علیہ اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "جس طرح دشمن کی نقل و حرکت اور اس کے حالات سے آگاہ رہنا ضروری ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اپنے حالات اور نقل و حرکت سے دشمن کو حتی الوسع بے خبر رکھا جائے۔ لہذا ایسے "فوجی راز" سوائے گنتی کے چند مشیروں اور معتمد خاص کے کسی کو معلوم نہیں ہونے چاہیے۔"(۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دشمن کی ہر بات کی خبر رکھنی چاہیئے اور اپنی خبروں سے اسے بے خبر رکھنا چاہیئے۔ رسول کریم ﷺ مندرجہ ذیل طریقوں سے اپنے دشمنوں کی معلومات حاصل کرتے تھے:

ا۔ جنگی طلایہ گرد دستوں کے ذریعے۔
ب۔ جاسوسوں کے واسطے سے۔
ج۔ شخصی اطلاعوں سے۔
د۔ قیدیوں سے۔
ہ۔ عقلمند لوگوں سے مشورہ کے ذریعے۔(۲)

فتح مکہ کی مہم میں رسول کریم ﷺ نے جنگی طلایہ گرد دستوں اور شخصی اطلاعوں کے ذریعے قریش مکہ کی معلومات حاصل کیں۔ آپ ﷺ قریش کی عہد شکنی کی تمام معلومات بنو خزاعہ کے دو وفود عمرو بن سالم بن کلثوم خزاعی(۳) کے وفد اور بدیل بن ورقاء خزاعی رضی اللہ عنہ کے وفد سے سن چکے تھے(۴) اور آپ ﷺ کو ان لوگوں کے ذریعے اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ قریش مکہ اس حملے کے بارے میں لاعلم ہیں۔ آپ ﷺ نے قریش مکہ کی

---

(۱) نبی اکرم ﷺ بحیثیت سپہ سالار، ص:۵۲
(۲) علوی، خالد، ڈاکٹر، انسان کامل ﷺ، الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور، ۱۹۷۴ء، ص:۳۱۷
(۳) عمرو بن سالم بن کلثوم خزاعی: آپ کا تعلق بنو خزاعہ سے تھا۔ آپ ایک شاعر تھے (اسد الغابۃ، ۲/۳۴۹)
(۴) سیرۃ ابن ہشام، ۴/۱۱

معلومات کے حصول کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نگرانی میں جنگی طلایہ گرد دستے مقرر کئے ہوئے تھے۔ابو سفیان کی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آمد کی اطلاع حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آکر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی۔ ان ذرائع کے ذریعے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش مکہ کی اطلاعیں بالکل صحیح وقت پہ مل جاتی تھیں۔

قریش مکہ کو مسلمانوں کے بارے میں کوئی اطلاع مہیا نہ ہو سکی۔ حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ نے بہت کوشش کی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادوں کے بارے میں اپنی بیٹی حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے معلومات حاصل کر سکیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔پھر حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ نے مدینہ کے مسلمانوں سے معلومات حاصل کرنی چاہیں لیکن انہیں کچھ معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔مدینہ سے مکہ کے راستے میں حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کی بنو خزاعہ کے وفد سے ملاقات ہوئی اور حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ نے ان سے مسلمانوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہی لیکن انہوں نے حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کے سامنے جھوٹ بولا کہ وہ مدینہ نہیں گئے تھے۔[۱] اس طرح قریش مکہ مکمل طور پر اندھیرے میں رہے اور انہیں مدینے والوں کی کوئی اطلاع نہیں مل سکی۔یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تین سو میل کا فاصلہ طے کرکے ان کے سر پر پہنچ گئے اور قریش کو خبر ہی نہ ہو سکی۔اسلامی فوج کے کیمپ کی روشنیاں اور آگ دیکھ کر انہیں پتا چلا کہ کوئی لشکر ان کے سر پر پہنچ چکا ہے اور ان سے مقابلہ کرنا ان کے بس سے باہر ہے۔

فتح مکہ میں جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی خبروں سے دشمن کو بے خبر رکھا اور دشمن کی خبروں سے خود آگاہ رہے۔ اسی طرح عصر حاضر میں ہر مسلمان ملک کو اپنے دشمنوں کی خبروں کو حاصل کرنے کا مؤثر انتظام کرنا چاہیے تاکہ کوئی ملک بے خبری میں بھاری نقصان نہ اٹھالے۔

سریع الحرکت فوج

ایک سپہ سالار کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے لشکر کی نقل و حرکت کو اتنا تیز رکھے کہ وہ اپنی منزل مقصود میں بہت تیزی کے ساتھ پہنچ سکے اور اس کے دشمن کو اس کی نقل و حرکت کا علم ہی نہ ہو سکے۔موجودہ دور میں ہر ملک نے انتہائی سریع الحرکت فورسز کو متعین کیا ہوا ہے، تاکہ جلدی دشمن کے خطرات اور چالوں کا مقابلہ کیا جا سکے۔رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کو ہمیشہ مد نظر رکھا اور مسلمان فوجیں اپنے مقاصد کے حصول کے لئے تیزی سے حرکت کرتی تھیں اور اپنی منزل مقصود پر مناسب وقت پر پہنچتی تھیں۔اس طرح دشمن کی تیاریاں مکمل ہونے سے پہلے اور اپنے ارادے میں کامیاب ہونے سے پہلے ہی ان کی سرکشی کو ختم کر دیا جاتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فوج کی نقل و حرکت بے حد سریع تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی افواج کی نقل و حرکت مناسب وقت پر کرواتے اور ان سے مناسب جگہ پر پہنچ کر صحیح عمل کرواتے۔اسی لئے مسلمانوں نے ہمیشہ کامیابی حاصل کی۔[۲]

---

(۱) سیرۃ ابن ہشام، ۴/ ۱۳

(۲) سروہی، محمد یسین، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی فوجی حکمت عملی، مشتاق بک کارنر، لاہور، ص:۶۱

اس کے بارے میں ڈاکٹر خالد علوی یوں بیان کرتے ہیں:

"رسول اللہ ﷺ کی قوت، مرونت اور آپ ﷺ کی فوج کی نقل و حرکت بے حد سریع تھی۔ ایسی تیزی جو اس زمانے کے نہایت طاقتور لشکر کی تیز رفتاری سے کم نہیں ہے۔"(۱)

فتح مکہ کی مہم میں رسول اکرم ﷺ نے اسی بہترین حربی حکمت عملی سے فائدہ اٹھایا۔ آپ ﷺ مکہ کی طرف دس رمضان المبارک آٹھ ہجری بدھ کے دن عصر کے بعد مدینہ سے روانہ ہوئے۔(۲) آپ ﷺ اپنی فوج کو اتنی تیزی سے حرکت میں لاتے ہوئے بغیر کسی توقف کے طائف کی وادی عرج کے راستے سے ہوتے ہوئے کدید(۳)، جحفہ(۴)، ذی الحلیفہ، ابواء(۵)، قدید(۶) کے علاقوں سے تیزی سے گزرتے ہوئے مکہ کی طرف بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ مدینہ سے مکہ کا راستہ تقریباً ایک ہفتہ میں طے کر کے رات کے وقت مکہ سے بائیس کلو میٹر شمال کی جانب مر الظہران پہنچ کر وہیں خیمہ زن ہو گئے۔

آپ ﷺ اپنی سریع الحرکت فوج کے ساتھ دشمن کے سر پر پہنچ گئے اور انہیں پتا ہی نہ چل سکا۔ آپ ﷺ اپنی فوج کے ساتھ سترہ رمضان المبارک کو مر الظہران سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے اور بیس رمضان آٹھ ہجری کو مکہ میں فاتحانہ طور پر داخل ہو گئے۔ آپ ﷺ کی فتح مکہ میں اسلامی فوج کی سریع الحرکت حکمت عملی کی بدولت قریش مکہ کو موقع ہی نہیں مل سکا کہ وہ اپنے حلیفوں سے رابطہ کر کے ان سے مدد حاصل کر سکیں۔

عصر حاضر میں ایک مسلم سپہ سالار کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ اپنی جنگی قوت کی نقل و حرکت کو اتنا تیز رکھے کہ وہ اپنی منزل مقصود پر بغیر کسی دشواری اور رکاوٹ کے پہنچ جائیں۔

نظم وضبط

حربی امور میں نظم وضبط کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے کیونکہ اگر جنگ میں نظم وضبط کا مظاہرہ نہ کیا جائے تو افراتفری اور غلط نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ سپہ سالار کو کامیابی حاصل کرنے کے لئے جنگی کاموں میں نظم وضبط اور منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے، لہذا اسے عقل و بصیرت اور منظم طریقے سے نیز اپنے اختیار میں جو وسائل و ذرائع ہیں انہیں مد نظر رکھتے ہوئے، صحیح منصوبہ بندی کے ساتھ اپنے اہداف کی جانب قدم بڑھانا چاہیے۔ محمد یسین سروہی فوج میں نظم وضبط کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

(۱) انسان کامل، ص:۳۴۱

(۲) سیرۃ ابن ہشام، ۴/ ۱۸

(۳) کدید: مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع ہے، امج اور عسفان کے درمیان ایک چشمہ ہے (معجم ما استعجم، ۱/ ۳۰۶)

(۴) جحفہ: مکہ اور مدینہ کے راستے میں ایک بستی کا نام ہے (معجم ما استعجم، ۱/ ۱۰۶)

(۵) ابواء: مدینہ کے مضافات میں سے ایک بستی ہے اس کے اور جحفہ کے درمیان تیئس میل کا فاصلہ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ آرہ اور مصعد کی دائیں جانب مکہ کی طرف پہاڑ ہے (حموی، یاقوت، معجم البلدان، دار صادر، بیروت، طبع دوم: ۱۹۹۵ء، ۱/ ۷۹)

(۶) قدید: مکہ اور مدینہ کے درمیان بحر احمر کے کنارے ایک آبادی ہے (معجم ما استعجم، ۱/ ۲۹۱)

"نظم وضبط ایک ایسا ہتھیار ہے جس کے بغیر کوئی لڑائی نہیں لڑی جاسکتی۔"(۱)

آپ ﷺ نے فتح مکہ میں فوج کے نظم وضبط کا خاص خیال رکھا۔ فتح مکہ میں مسلمانوں کے لشکر کی تعداد دس ہزار تھی اور ان کا تعلق مختلف قبائل(۲) سے تھا۔ ان سب لوگوں کے درمیان اتحاد تھا اور ان کا مقصد ایک تھا، اسی لئے کفار کو ان سے مقابلے کی جرأت نہ ہو سکی۔ آپ ﷺ نے تمام قبائل کی فوجوں کو حکم جاری کیا کہ وہ بغیر کسی نقصان اور خون ریزی کے جبل ہند پر پہنچیں۔ تمام فوج آپ ﷺ کے حکم پر عمل کرتے ہوئے جبل ہند کے مقام پر اکٹھی ہوگئی اور سارے مکہ کو محاصرے میں لے لیا(۳)۔

فتح مکہ میں فوج نے نظم وضبط کا مظاہرہ کیا اور کامیابی حاصل کی۔ اسی طرح موجودہ دور میں فوج کے اندر نظم ضبط ہونا چاہیے تاکہ وہ کامیابی سے ہمکنار ہو سکیں۔

راستوں کو کنٹرول کرنے کے لیے چیک پوسٹ

ہر ملک میں سیکورٹی کے سخت انتظامات کئے جاتے ہیں اور ملک کے داخلی اور خارجی راستوں پر، اہم مقامات اور چوراہوں پر فوجی اہلکاروں، رینجرز اور پولیس کی مشترکہ ٹیموں پر مشتمل اہلکاروں کی چیک پوسٹیں قائم کی جاتیں ہیں، کیونکہ ان چیک پوسٹوں سے ملک میں داخل ہونے والوں کی چھان بین کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے فتح مکہ میں راستوں کو کنٹرول کرنے کے لئے انتظامات کیے۔ آپ ﷺ دشمن کو غافل رکھنے کے لیے نہایت خفیہ طریقہ سے قدم اٹھا رہے تھے اور بہت باریک بینی سے کام لے رہے تھے۔ اس کام کے لیے آپ ﷺ کے حکم سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نگرانی میں مدینہ کے آس پاس اور مدینہ سے مکہ کے تمام راستوں پر پہرے بٹھا دیئے گئے تھے اور مشکوک افراد کی آمد اور روانگی پر کڑی نگاہ رکھی جارہی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قریش کے جاسوس لشکر اسلام کی روانگی سے آگاہ ہو جائیں۔(۴)

موجودہ دور میں سیکورٹی کے خدشات کے پیش نظر راستوں کو کنٹرول کرنے کے لئے انتظامات کرنا بہت ضروری ہو گئے ہیں، تاکہ کوئی دشمن ملک میں داخل ہو کر آپ کی معلومات نہ حاصل کر سکے۔

نفسیاتی دباؤ

موجودہ دور میں روایتی جنگ سے زیادہ نفسیاتی جنگ کی اہمیت ہے کیونکہ نفسیاتی طور پر دشمن کے ذہن کو مختلف حربوں سے متاثر کر کے مفلوج اور ان کے عزم وحوصلوں کو کمزور کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح دشمن کو بے بس

---

(۱) نبی کریم ﷺ کی فوجی حکمت عملی، ص:۶۴

(۲) مہاجرین، انصار، بنی مزینہ، بنی اسلم، بنی جہینہ، بنو کعب بن عمرو، بنی سلیم، بنو خزاعہ، بنو غفار، بنو اشجع، بنو لیث، بنو کنانہ، بنو ضمرہ، بنو سعد اور بنو تمیم

(۳) عین الحق، محمد، سیرت النبی تمام سیرت نگار، عبداللہ برادرز، لاہور، ص:۲۳۴

(۴) مغازی، ۲/ ۸۲۲

کر کے فتح حاصل کی جاتی ہے۔ اس میں جانی اور مالی نقصان سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ نفسیاتی جنگ سے دشمن کی مادی اور معنوی طاقت کا خاتمہ کیا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں محمد بن مخلف یوں بیان کرتے ہیں:

" نفسیاتی جنگ کا بنیادی مقصد تو معنوی طاقت کو ختم کرنا ہی ہوتا ہے۔ لیکن معنوی طاقت کے مفلوج و مسدود ہو جانے سے مادی طاقت از خود مفقود ہو جاتی ہے۔ "(۱)

آپ ﷺ نے فتح مکہ میں دشمن پر نفسیاتی دباؤ کا حربہ اختیار کیا کیونکہ آپ ﷺ کا مقصد تھا کہ طاقت کے استعمال کے بغیر نفسیاتی محاذ پر دشمن کو شکست دی جائے۔ ان کے اندر مقابلہ کرنے کی روح ختم کی جائے اور وہ بغیر لڑائی کے ہتھیار ڈال دیں۔ اسی وجہ سے مر الظہران پہنچ کر نبی اکرم ﷺ نے اپنی فوج کے ہر سپاہی کو کہا کہ وہ الگ الگ آگ روشن کریں۔(۲) اس طرح دشمن پر مسلمانوں کی تعداد زیادہ ظاہر ہو۔ آگ سے تمام صحرا روشن ہو گیا۔ ابوسفیان بن حرب، حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقاء رضی اللہ عنہم تحقیق کے لئے باہر نکلے اور جب انہوں نے دس ہزار چولہوں کو روشن دیکھا تو ان پر سکتہ طاری ہو گیا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو اپنے خچر پر سوار کر کے رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر کیا تو آپ نے ان کو امان دے دی۔(۳) دوسرا رسول اکرم ﷺ نے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے کے لئے پہاڑ کے ناکے پر وادی کی تنگ جگہ پر کھڑا کرا دیا تا کہ وہ لشکر اسلام کو دیکھ سکیں۔(۴) اس طرح کے اقدامات سے ان کے حوصلے پست ہو گئے۔

آپ ﷺ نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ ان کو رہا کر دیں تا کہ وہ اپنی قوم میں جا کر ان کے حوصلوں کو متزلزل کریں۔ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے اس کام کو بخوبی انجام دیا۔ رسول اکرم ﷺ کا حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ پر اختیار کردہ نفسیاتی وار خالی نہیں گیا اور جب یہ مکہ گئے تو انہوں نے مکہ جا کر لوگوں کو رسول کریم ﷺ کے لشکر کے بارے میں اطلاع دی۔ ان کی بیوی ہند بنت عتبہ(۵) نے لوگوں کو حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی باتوں پر یقین نہ کرنے کو کہا تو حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے غصے سے قریش مکہ کو کہا:

"وَيْلَكُمْ لَا تَغُرَّنَّكُمْ هَذِهِ مِنْ أَنْفُسِكُمْ فَإِنَّهُ قَدْ جَاءَكُمْ مَا لَا قِبَلَ لَكُمْ بِهِ فَمَنْ دَخَلَ دَارَ أَبِي سُفْيَانَ فَهُوَ آمِنٌ قَالُوا: قَاتَلَكَ اللهُ وَمَا تُغْنِي عَنّا دَارُك، قَالَ وَمَنْ أَغْلَقَ عَلَيْهِ بَابَهُ فَهُوَ آمِنٌ وَمَنْ دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَهُوَ آمِنٌ فَتَفَرّقَ النّاسُ إلَى دُورِهِمْ وَإِلَى الْمَسْجِدِ"(۶)

---

(۱) مخلف، محمد بن مخلف بن صالح، الحرب النفسیۃ فی صدر الاسلام، دار عالم الکتب، الریاض، ۱۹۹۲ء، ص:۴۹۷

(۲) طبقات کبریٰ، ۲/۱۳۵

(۳) مغازی، ۲/۸۱۸

(۴) صحیح بخاری، حدیث نمبر:۴۲۸۰، ۵/۱۴۶

(۵) ہند بنت عتبہ رضی اللہ عنہا: آپ معاویہ بن ابوسفیان کی والدہ تھیں۔ آپ غزوہ احد میں شریک تھیں اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کا مثلہ کیا۔ مسلمانوں کے بہت خلاف تھیں لیکن فتح مکہ کے دن اسلام قبول کر لیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت میں وفات پائی (الاصابہ فی تمییز الصحابہ، ۸/۱۵۵)

(۶) سیرۃ ابن ہشام، ۴/۲۴

اس کے بہکاوے میں آکر دھوکے میں مبتلا نہ ہو، محمد ﷺ لشکر لے کر آگئے ہیں۔ جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے، اسے امان ہے۔ تو لوگوں نے کہا کہ اللہ تجھے مارے، تیرے گھر کتنے آدمی سما سکتے ہیں؟ حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ نے کہا جو اپنا دروازہ اندر سے بند کرلے، اسے بھی امان ہے اور جو مسجد حرام میں داخل ہو جائے، اسے بھی امان ہے۔ یہ سنتے ہی لوگ تیزی سے اپنے گھروں کو اور بہت سے مسجد حرام میں داخل ہوئے۔

ان الفاظ میں ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے مکہ والوں کو اپنی بیوی کی باتوں پر یقین نہ کرنے کا کہا اور اسلامی لشکر اور رسول اکرم ﷺ کے مقرر کردہ امن کے لئے مخصوص کیے گئے مقامات کے بارے میں بتایا۔

آپ ﷺ کے اس طرح کے اقدامات کی وجہ سے مکہ میں قریشیوں کو ہراساں کرنے اور بغیر خونریزی کے ہتھیار ڈال دینے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اس طرح نفسیاتی طور پر ان کے حوصلے کمزور ہو گئے اور مسلمانوں کی ہیبت سے ان کے خلاف کوئی بھی اقدام نہ کر سکے۔ فتح مکہ میں جس طرح آپ ﷺ نے ایسے اقدامات کیے کہ جس سے قریش مکہ کے حوصلے پست ہو گئے اور انہوں نے مسلمانوں سے لڑائی کرنے کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا۔ اسی طرح عصر حاضر میں مسلم امہ کے سپہ سالاروں کو چاہیے کہ وہ اپنے مخالفین کے حوصلے پست کرنے کے لئے نفسیاتی حربے استعمال کریں۔

دوراندیشی

سپہ سالار کی بہترین حربی حکمت عملیوں میں سے ایک اس کی دور اندیشی کی صفت ہوتی ہے۔ یہ حربی حکمت عملی سپہ سالار کے لئے بے حد ضروری ہے۔ اس کے ذریعہ سپہ سالار کو مساعد اور نا مساعد حالات کا صحیح احساس ہوتا ہے اور وہ ہر قسم کی صورت حال کا مقابلہ کرنے کی تیاری پہلے سے کرلیتا ہے۔[۱] سپہ سالار کو دشمن پر فتح حاصل کرنے کے لئے دوراندیشی سے کام لے کر منصوبے بنانے چاہیئں کیونکہ اگر دوراندیشی سے کام نہیں لیا جائے گا تو اہداف و مقاصد صرف خواب اور آرزو ہی بن کر رہ جائیں گے۔ سپہ سالار کے لئے دوراندیشی کی صفت سے متصف ہونا ضروری ہے۔ محمود خطاب شیت اس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "کامیاب سپہ سالار وہ ہوتا ہے جو دوسری خوبیوں کے علاوہ دور اندیشی کی صفت سے موصوف ہو اور ہر احتمال کے لئے ضروری تدابیر اختیار کرے، یہ نہ ہو کہ تمام معاملات تقدیر کے حوالے کر دے"۔[۲]

فتح مکہ میں رسول کریم ﷺ نے دوراندیشی کا ثبوت دیا۔ آپ ﷺ کو اس چیز کا اندازہ تھا کہ قریش مقابلہ

---

(۱) انسان کامل، ص:۳۱۹

(۲) شیت، خطاب محمود، آنحضرت ﷺ بحیثیت سپہ سالار، ترجمہ: سید رئیس احمد جعفری، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص:۴۱۹

نہیں کریں گے اور وہ ہتھیار ڈال دیں گے۔ لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے دوراندیشی سے کام لے کر یہ تدبیر اختیار کی کہ آپ ﷺ نے بدترین حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنی فوج کو منظم کیا اور شہر کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا۔ آپ ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ کدیٰ[1] کے راستے مکہ میں زیریں حصے سے داخل ہوں۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ کداء کے راستے بالائی حصے سے مکہ میں داخل ہوں۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ کہ وہ اذاخر کی طرف سے مکہ کی بلندی پر آئیں۔ رسول اکرم ﷺ اذاخر[2] کی پہاڑی کے راستے آئے۔ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ[3] کو آپ ﷺ نے حکم دیا کہ وہ مغرب کے راستے مکہ میں داخل ہو۔ آپ ﷺ نے ہر سمت میں اتنی فوج متعین کر دی کہ وہ خود بغیر کسی کی مدد کے ان کا مقابلہ کر سکیں۔ فتح مکہ میں آپ ﷺ نے دوراندیشی کا ثبوت دے کر عظیم الشان کامیابی حاصل کی۔ اسی طرح موجودہ دور میں مسلمان سپہ سالار کو اپنے دشمن کو شکست دینے کے لئے پہلے سے منصوبہ بندی کرنی چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ کامیابی اس کو عطا کرتے ہیں جو اس کے لئے پوری تیاری کرتا ہے۔

فوج کے دستوں کی تقسیم اور افسروں کا تعین

جس طرح موجودہ دور میں فوج کو بٹالین میں تقسیم کیا جاتا ہے اور ان دستوں کے افسران مقرر کیے جاتے ہیں۔ آج سے چودہ سو سال پہلے آپ ﷺ نے اپنے لشکر میں سے افسران کا تعین کیا تھا۔

فتح مکہ کے دوران مدینہ سے مکہ کی طرف اسلامی لشکر بغیر ترتیب کے روانہ ہوا تھا۔ کیونکہ بعض قبائل راستے میں آکر آپ ﷺ کی فوج میں شامل ہوئے۔ جب قدید کے مقام پر پوری فوج اکٹھی ہو گئی تو نبی اکرم ﷺ نے قدید کے مقام پر پڑاؤ کیا تاکہ لشکر اسلام کچھ دیر آرام کرلے۔ یہاں پر آپ ﷺ نے فوج کی تیاری کی اور فوج کو دستوں میں تقسیم کیا اور دستوں کے افسران مقرر کئے۔ آپ ﷺ نے فوج کی تیاری قبائلی بنیادوں پر کی اور ہر قبیلے کے مختلف خاندانوں کے دستے بنائے اور اسی خاندان کے فرد کو اس دستے کا افسر مقرر کیا۔

بنو اوس کے چھ دستے بنائے اور ان کے افسران ابو نائلہ[4]، قتادہ[5]، ابو بردہ[6]، جبر بن عتیک، ابو لبابہ بن

---

(۱) کدی: مکہ معظمہ میں کداء کے قریب ایک پہاڑ ہے (معجم ما استعجم، ۱/۳۰۶)

(۲) سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ: آپ کا تعلق بنو خزرج سے تھا۔ آپ کی والدہ کا نام عمرہ بنت مسعود رضی اللہ عنہا تھا اور وہ صحابیہ تھیں۔ آپ بیعت عقبہ ثانیہ میں شامل تھے۔ آپ نے حوران میں پندرہ ہجری اور بعض کے نزدیک سولہ ہجری میں وفات پائی (تہذیب التہذیب، ۳/۴۱۲)

(۳) اذاخر: مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک گھاٹی ہے (معجم ما استعجم، ۱/۳۹)

(۴) ابو نائلہ رضی اللہ عنہ: آپ کا نام سلکان بن سلامہ تھا۔ آپ کا تعلق انصار سے تھا۔ آپ بہترین تیر انداز اور شاعر تھے۔ آپ غزوہ احد اور بعد کے غزوات میں شریک ہوئے (الاصابۃ فی تمییز الصحابہ، ۷/۴۰۹)

(۵) قتادہ رضی اللہ عنہ: آپ کا نام قتادہ بن نعمان اور کنیت ابو عمرو تھی۔ آپ کا تعلق قبیلہ اوس سے تھا۔ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ ۲۳ھ میں فوت ہوئے۔ (اسد الغابہ، ۲/۴۰۷)

(۶) ابو بردہ رضی اللہ عنہ: آپ کا نام ہانی بن نیار تھا۔ انصار کے حلیف تھے اور تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ آپ معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں شہید ہوئے۔ (اسد الغابہ، ۳/۱۴۳)

عبد المنذر[۱] اور مبیض رضی اللہ عنہم[۲] مقرر کئے، بنو خزرج کے چھ دستے تشکیل دیئے اوران کے افسران ابو اسید الساعدی[۳]، عبد اللہ بن زید[۴]، قطبہ بن عامر[۵]، عمارہ بن حزم[۶] اور سلیط بن قیس رضی اللہ عنہم[۷] مقرر فرمائے۔ مہاجرین کے تین دستے بنائے اوران کے افسران علی بن ابی طالب، زبیر بن عوام اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم مقرر کئے، بنو مزنیہ کو تین دستوں میں تقسیم کیا اوران کے افسران نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ[۸]، بلال بن حارث اور عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ مقرر کئے۔ بنو جہینہ کے چار دستے بنائے اوران کے افسران سوید بن صخر[۹]، رافع بن مکیث[۱۰]، ابو زرعہ[۱۱] اور عبد اللہ بن بدر رضی اللہ عنہم[۱۲] مقرر ہوئے، بنو سلیم کے تین دستے بنائے اوران کے افسران عباس بن مرداس[۱۳]، خفاف بن ندبہ اور حجاج بن علاط رضی اللہ عنہم مقرر کئے۔

---

(۱) ابو لبابہ بن عبد المنذر رضی اللہ عنہ: آپ کا نام رفاعہ بن عبد المنذر تھا۔ بیعت عقبہ میں شریک تھے۔ انصار کے بارہ نقیبوں میں سے تھے۔ آپ کا انتقال حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ہوا (اسد الغابہ، ۳/۲۳۶)

(۲) مبیض رضی اللہ عنہ: آپ کا نام مبیض یا نبیض تھا۔ آپ کا تعلق انصار سے تھا(الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ۳/۵۸۹)

(۳) ابو اسید رضی اللہ عنہ: آپ کا نام مالک بن ربیعہ تھا۔ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ ۶۰ ہجری میں وفات پائی(الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ۵/۷۲۳)

(۴) عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ: آپ بیعت عقبہ اور غزوہ بدر میں شریک ہوئے اور غزوہ احد میں شہید ہوئے (اسلام کے فیصلہ کن معرکے فتح مکہ، ص:۱۷۴)

(۵) قطبہ بن عامر رضی اللہ عنہ: آپ کی کنیت ابو زید تھی۔ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ آپ کا انتقال حضرت عثمان کے دور خلافت میں ہوا۔(اسد الغابہ، ۲/۴۱۲)

(۶) عمارہ بن حزم رضی اللہ عنہ: آپ کا تعلق انصار سے تھا۔ بیعت عقبہ میں شریک تھے۔ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ آپ نے جنگ یمامہ میں شہادت پائی(اسد الغابہ، ۲/۳۱۱)

(۷) سلیط بن قیس رضی اللہ عنہ: آپ کا تعلق انصار سے تھا۔ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ جنگ جسر میں شہادت پائی(الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ۳/۱۶۳)

(۸) نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ: آپ کا تعلق بنو مزینہ سے تھا۔ آپ نے اصبہان فتح کیا۔ ۲۱ ہجری میں وفات پائی(الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ۶/۴۵۳)

(۹) سوید بن صخر رضی اللہ عنہ: آپ کا تعلق بنو جہینہ سے تھا۔ قدیم الاسلام تھے۔ حدیبیہ اور فتح مکہ میں شریک ہوئے۔(اسد الغابۃ، ۱/۹۴)

(۱۰) رافع بن مکیث الجہینی رضی اللہ عنہ: آپ بیعت رضوان میں شریک تھے اور فتح مکہ کے دن جہینہ کا پرچم اٹھائے ہوئے تھے۔(الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ۲/۴۴۵)

(۱۱) ابو زرعہ رضی اللہ عنہ: آپ کا نام زید بن خالد تھا۔ بنو جہینہ سے تھے۔ بیعت رضوان میں شریک تھے اور فتح مکہ کے دن بنو جہینہ کا پرچم اٹھائے ہوئے تھے، ۷۸ ہجری کو مدینہ میں وفات پائی(الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ۲/۶۰۳)

(۱۲) عبد اللہ بن بدر رضی اللہ عنہ: آپ کا نام عبد العزی تھا جسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبدیل کیا۔ آپ نے غزوہ احد میں شرکت کی۔ فتح مکہ کے دن بنو جہینہ کا پرچم اٹھائے ہوئے تھے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں فوت ہوئے۔(الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ۴/۱۹)

(۱۳) عباس بن مرداس رضی اللہ عنہ: آپ کی کنیت ابو الہیثم یا ابو الفضل تھی۔ آپ نے فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کیا(اسد الغابۃ، ۲/۷۷)

بنو خزاعہ تین دستوں میں تقسیم ہوئے بنائے اوران کے افسران بسر بن سفیان[۱]، ابن شریح[۲] اور عمرو بن سالم رضی اللہ عنہم مقرر کئے گئے۔ بنو اسلم کے دو دستے بنائے اوران کے افسران بریدہ بن حصیب[۳] اور ناجیہ بن اعجم رضی اللہ عنہما[۴] قرار پائے۔ بنو غفار کا ایک دستہ بنایا اور ان کا افسر ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کو بنایا۔ بنو لیث کا ایک دستہ بنایا اور ان کا افسر صعب بن جثامہ رضی اللہ عنہ[۵] کو مقرر کیا۔ بنو اشجع کے دو دستے بنائے اور ان کے افسران نعیم بن مسعود[۶] اور معقل بن سنان رضی اللہ عنہما[۷] کو بنایا۔ بنو تمیم کا ایک دستہ بنایا اور ان کا افسر اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ[۸] کو بنایا۔[۹]

جس طرح فتح مکہ میں رسول کریم ﷺ نے اپنے لشکر میں سے افسران کا تعین کیا۔ اسی طرح موجودہ دور میں محنتی اور ذہین افسران متعین کرنے سے اہل اسلام اپنی فوج کو کامیابیوں سے روشناس کرا سکتے ہیں۔

حصولِ مقصد کے لئے کم سے کم جانی نقصان

عصر حاضر میں ایک عظیم سپہ سالار کی حکمت عملی یہ ہونی چاہیے کہ فتح کا مقصد بھی حاصل ہو جائے اور جانی نقصان بھی کم سے کم ہو خواہ یہ نقصان اپنی فوج کی طرف سے ہو یا دشمن کی۔ اگر دشمن کے بے دریغ لوگوں کو قتل کر کے فتح حاصل کی جائے تو ایسی فتح کا تعلق فوج کی بہادری سے تو ہو سکتا ہے لیکن سپہ سالار کی حکمت عملی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جنگ کا اصل مقصد قتل وغارت نہیں بلکہ علاقہ کو فتح کرنا ہوتا ہے۔ ایسی فتح سپہ سالار کی عظمت

---

(۱) بسر بن سفیان رضی اللہ عنہ: آپ کا تعلق بنو خزاعہ سے تھا۔ آپ نے ۶ ہجری میں اسلام قبول کیا۔ (الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ۱/۲۹۲)

(۲) ابن شریح رضی اللہ عنہ: آپ کا نام خویلد بن عمرو تھا۔ فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کیا۔ آپ نے ۶۸ ہجری میں وفات پائی (اسد الغابۃ، ۳/۱۹۵)

(۳) بریدہ بن الحصیب رضی اللہ عنہ: آپ کی کنیت ابو عبد اللہ تھی۔ بیعت رضوان میں شریک تھے۔ مدینہ کے رہنے والے تھے مگر بعد میں بصرہ چلے گئے اور مرو میں وفات پائی۔ (اسد الغابۃ، ۱/۱۱۰)

(۴) ناجیہ بن اعجم رضی اللہ عنہ: آپ بیعت رضوان میں شریک تھے۔ معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں فوت ہوئے۔ (الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ۶/۳۹۸)

(۵) صعب بن جثامہ رضی اللہ عنہ: آپ کا تعلق بنو لیث سے تھا۔ آپ کی والدہ ابو سفیان بن حرب کی بہن تھی۔ فتح اصطخر میں شریک ہوئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں وفات پائی (الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ۳/۴۲۶)

(۶) نعیم بن مسعود رضی اللہ عنہ: آپ کا تعلق بنو غطفان سے تھا۔ کنیت ابو سلمہ تھی۔ غزوہ خندق کے موقع پر اسلام قبول کیا اور غزوہ خندق کے موقع پر بنو قریظہ، غطفان اور قریش میں بدگمانی پیدا کر کے ایک دوسرے کا مخالف بنا دیا۔ آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں وفات پائی۔ (اسد الغابۃ، ۳/۷۲۔۷۳)

(۷) معقل بن سنان رضی اللہ عنہ: آپ پہلے اسلام قبول کرنے والوں میں سے تھے۔ جنگ حنین اور فتح مکہ کے موقع پر اپنی قوم کا پرچم اٹھائے ہوئے تھے، آپ نے ۶۳ ہجری میں مدینہ میں وفات پائی۔ (الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ۶/۱۸۱)

(۸) اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ: آپ کا تعلق بنو تمیم سے تھا۔ آپ فتح مکہ، غزوہ حنین اور غزوہ طائف میں شریک ہوئے۔ جوز جان میں شہید ہوئے (الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ، ۱/۱۰۱)

(۹) اسلام کے فیصلہ کن معرکے فتح مکہ، ص: ۱۷۱-۱۸۲

کی دلیل اور اس کی اہم خوبی ہوتی ہے جس میں کم سے کم نقصان ہو اور مقصد بھی حاصل ہو جائے۔ غلام غوث ہزاروی[۱] اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اس سے بڑھ کر کوئی خوبی کسی فوجی جرنیل میں نہیں ہو سکتی کہ کامیابی حاصل کرنے کے لئے کم سے کم انسانی جانیں ضائع کرے۔"[۲]

فتح مکہ میں رسول اکرم ﷺ کی حکمت عملی یہ تھی کہ آپ ﷺ مکہ کو بغیر کسی جانی نقصان کے پر امن طور پر فتح کرنا چاہتے تھے۔ آپ ﷺ نے طے کر لیا تھا کہ مکہ میں اسلامی لشکر بغیر خون ریزی کے داخل ہو گا اور قریش کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ آپ ﷺ نے اپنے سالاروں کو مکہ میں ہتھیار استعمال کرنے سے منع کیا اور چند لوگوں کے سوا کسی شخص کو قتل نہ کرنے کا حکم دیا۔[۳] آپ ﷺ نے حجاز کے مرکزی شہر مکہ کو فتح کیا تو صرف دو مسلمان شہید ہوئے[۴] اور بارہ مشرکین مکہ مارے گئے[۵]۔

درج بالا تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ کم سے کم جانی نقصان کے ساتھ بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کی جا سکتیں ہیں۔ موجودہ دور کے سپہ سالاروں کو ایسی حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے کہ کم سے کم نقصان ہو اور مقصد کو بھی حاصل کیا جا سکے۔

شہر کے محاصرہ کی ترکیب

محاصرہ ایک جنگی حربہ ہوتا ہے جس میں دشمن کے علاقے کا گھیراؤ کیا جاتا ہے اور تمام ذرائع آمد و رفت بند کر دیے جاتے ہیں۔ رسول اکرم ﷺ نے فتح مکہ میں اسی جنگی حربے کو اختیار کیا تھا۔ آپ ﷺ نے چاروں طرف سے مکہ کا محاصرہ کر دیا تھا اور اپنی فوج کو اکٹھے ایک ہی سمت سے مکہ میں داخل ہونے کا حکم نہیں دیا بلکہ سپاہیوں کو چار دستوں میں تقسیم فرمایا اور ہر ایک دستہ کو ایک سمت سے شہر کے اندر داخل ہونے کا حکم دیا۔ میسرہ کی قیادت حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو تفویض کی اور انہیں حکم دیا کہ شمال کی جانب سے مکہ میں داخل ہوں۔ میمنہ لشکر کا سالار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا اور انہیں ہدایت دی گئی کہ وہ جنوب کی جانب سے مکہ میں داخل ہوں۔ انصار کی قیادت حضرت

---

(۱) غلام غوث ہزاروی: آپ لفہ (ضلع مانسہرہ) میں پیدا ہوئے۔ آپ نے چند سالوں میں جمعیت علماء اسلام کو ملک کی بڑی سیاسی جماعت بنا دیا۔ آپ نے برطانوی سامراج کے خلاف آزادی کی جنگ میں متحرک کردار ادا کیا تھا اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ آپ کو لفہ میں دفن کیا گیا۔ (الراشدی، زاہد، غلام غوث ہزاروی، ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ، جون ۱۹۹۳ء)

(۲) ہزاروی، غلام غوث، جنگ سیرۃ نبوی ﷺ کی روشنی میں، مکی دار الکتب، لاہور، دسمبر ۱۹۹۶ء، ص: ۲۰

(۳) سیرۃ ابن ہشام، ۴/ ۲۸

(۴) طبقات کبری، ۲/ ۱۳۶

(۵) سیرۃ ابن ہشام، ۴/ ۲۹

سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو سونپی اور انہیں نے حکم دیا کہ وہ مغرب کے راستے مکہ میں داخل ہوں۔ مہاجرین کی قیادت حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کو سونپی اور انہیں فرمان ملا کہ وہ شمال مغرب کی جانب سے جبل ہند سے گزرتے ہوئے مکہ میں داخل ہوں۔[۱] آپ ﷺ کا لشکر کی ترتیب و تقسیم کے بارے میں سر ولیم میور[۲] یوں لکھتا ہے:

"محمد نے لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کر کے مختلف راستوں سے شہر میں داخلہ کا حکم دیا اور سختی سے ہدایت کی کہ سوائے انتہائی مجبوری اور خود حفاظتی کے جنگ نہیں کرنی"۔[۳]

رسول کریم ﷺ نے چاروں طرف سے شہر کے محاصرہ کی ترکیب اپنا کر مشرکین کے فرار ہونے کی کوشش کو ختم کر لیا اور اس طرح ان کے پاس صرف ایک راستہ باقی رہ گیا کہ وہ ہتھیار ڈال دیں۔ گویا کہ دشمن کا محاصرہ کرنے سے اس پر قابو پایا جا سکتا ہے اور وہ بھاگ نہیں سکتا۔ یہ ایک کامیاب جنگی حربہ ہے۔ اس لئے عصر حاضر میں اس سے کام لے کر دشمن کو گرفتار کیا جائے۔ اس ترکیب سے جہاں جنگی مقاصد حاصل ہوتے ہیں وہاں بڑے پیمانے پر قتل و غارت سے بھی بچا جا سکتا ہے۔ اہلِ ایمان کا مقصد دین کا پرچار اور کلمہ حق کا غلبہ ہے نہ کہ قتل و غارت، لہٰذا اس حکمت اپنی کو اپنانا ہر مسلمان جرنیل کی اشد ضرورت ہے۔

غیر متوقع حملہ

غیر متوقع حملہ جنگ کے میدان میں سب سے موثر، طاقتور اور دیرپا حربہ ہوتا ہے۔ جنگ میں غیر متوقع حملہ کرنا چاہیے، جس کی دشمن کو توقع نہ ہو اور وہ اس کے لئے تیار ہی نہ ہو۔ جنگ میں ہمیشہ وہ سپہ سالار کامیاب ہوتا ہے جو غیر متوقع کاروائی کرتا ہے۔ غلام غوث ہزاروی اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"جب دو قوموں میں حالت جنگ قائم ہے تو کامیاب اور قابل قائد کی خوبی اور لیاقت یہ ہے کہ دشمن کو خبر ہی نہ ہونے دے اور وہ اسے جا دبوچے۔"[۴]

عصر حاضر میں سپہ سالار کو اس جنگی حربہ سے کام لینا چاہیے۔ رسول اکرم ﷺ کی حربی حکمت عملی ہمیشہ اس حربہ پر منحصر رہی۔ کامیاب غیر متوقع حملے کے لئے مندرجہ ذیل امور ضروری ہیں:

ا۔ جنگی ضروریات کے لئے اپنے ارادے اور طاقت کو مخفی رکھنا چاہیے۔

ب۔ ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف تیزی سے حرکت کرنا چاہیے۔

---

(۱) طبری، محمد بن جریر، تاریخ الامم والرسل والملوک، دار الکتب العلمیہ، بیروت، طبع اول: ۱۴۰۷ھ، ۲/ ۱۵۹

(۲) سر ولیم میور: آپ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ انگریز تھے۔ برطانوی حکومت کے دور میں غیر منقسم ہندوستان کی ایک ریاست کے گورنر تھے۔ آپ کی مشہور کتاب "لائف آف محمد" تھی (خان، وحید الدین، دفاع یا دعوت، الرسالہ، جون ۲۰۱۵ء)

(۳) میور، ولیم، لائف آف محمد، انگریزی ایڈیشن، لندن، ص: ۴۶

(۴) جنگ سیرۃ نبوی ﷺ کی روشنی میں، ص: ۲۳

ج۔ غیر متوقع راستوں پر چلنا چاہیے۔
د۔ غیر متوقع وقت کا انتخاب کرنا چاہیے۔
ہ۔ غیر متوقع ہتھیاروں کا استعمال کرنا چاہیے۔
و۔ نئے جنگی اسلوب اپنانے چاہیے۔(۱)

رسول کریم ﷺ نے فتح مکہ میں اپنے ارادوں کو مخفی رکھ کر، سریع الحرکت فوج اور غیر متوقع راستوں پر چلتے ہوئے غیر متوقع حملے کے حربے کو استعمال کیا اور کامیابی حاصل کی۔ آپ ﷺ نے فتح مکہ میں بھی اپنے ارادے کو مخفی رکھا(۲) کیونکہ آپ ﷺ دشمن پر ناگہانی حملہ کرنا چاہتے تھے تاکہ دشمن حیرت زدہ ہو جائے اور وہ سوچ ہی نہ سکے کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ دشمن لڑائی کے بارے میں سوچے بغیر ہتھیار ڈال دے۔ قریش مکہ نے اسی طرح کیا اور ہتھیار ڈال دیئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سرکار دوعالم ﷺ کی حیات طیبہ منبع الکمالات ہے اور اس میں ایک کمال لاجواب، بے نظیر و بے مثال سپہ سالار ہونا بھی ہے جس کا ثبوت غزوات النبی ﷺ میں بہترین دادِ شجاعت اور لازوال کامیابیاں ہیں۔ ان غزوات اور بالخصوص فتح مکہ کے مطالعہ کی روشنی میں درج ذیل سفارشات پیشِ خدمت ہیں:

سفارشات

۱۔ امت مسلمہ کو اپنے حربی و دفاعی معاملات کا حل اور حربی مسائل کو ختم کرنے کے لئے فتح مکہ میں آپ ﷺ کی حربی حکمت عملی سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔
۲۔ کسی اسلامی سلطنت کا غیر اسلامی ممالک کے ساتھ معاہدہ ہو۔ وہ معاہدہ توڑ دیں تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ جس طرح ممکن ہو اس سے باز پرس کرے۔ ان کے عمل کی وجہ سے انہیں سبق سکھانا چاہیے۔
۳۔ عسکری قوت کا زیادہ سے زیادہ اہتمام و انتظام نہ صرف دشمن پر خوف طاری کرنے کے لئے بلکہ حملے سے باز رکھنے کے لئے بھی ضروری ہے۔
۴۔ سپہ سالار کو فتح کے دن ذاتی انتقام سے گریز اور عاجزی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔
۵۔ تمام مسلم ممالک اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اسلحہ سازی میں مکمل خود کفالت حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ انہیں اپنی دفاعی صلاحیتوں کو مضبوط بنانا چاہیے۔
۶۔ مسلمان سپہ سالاروں کو جنگ میں دور جاہلیت کے اختیار کردہ وحشیانہ اصولوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔

---

(۱) نبی کریم ﷺ کی فوجی حکمت عملی، ص:۵۲
(۲) سیرۃ ابن ہشام، ۴/۱۵

۷۔ اگر جنگی صورت حال ہو تو سپہ سالار کو جنگی کاروائیوں، قیدیوں اور عام شہریوں کے سلسلے میں اسلام کی ہدایات کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

۸۔ آپ ﷺ میں بحیثیت سپہ سالار جو ذاتی اوصاف و کمالات تھے۔ موجودہ دور میں ہر مسلمان سپہ سالار کو اپنے اندر پیدا کرنے چاہیے۔

۹۔ دشمن کو جنگ کے بغیر مطیع کرنا چاہیے۔

۱۰۔ دشمن کو خوفزدہ کرنے کے لئے فوجی مظاہرہ کرنا چاہیے۔

سیرت طیبہ میں بلدیاتی نظام (میونسپلٹی) اور بنیادی عوامی سہولیات کے خدوخال

Municipality and Basic Needs of Citizens in the Light of Sīrat-e-Ṭayyibah

ڈاکٹر جنید اکبر *

محمد کامران **

ABSTRACT

This study examines the community services and facilities provided in the State of Madīnah in the life of Holy Prophet (ﷺ), for seeking guidance in the social development of community by fulfilling the basic needs of citizens in the modern-day. By declaring Medina a first Muslim state, the Holy Prophet (ﷺ) rendered invaluable services for the betterment of his people. He stressed upon providing fundamental rights of the human beings. The focus of this article is to shed light upon the ways of providing the most important needs of the citizens, which have been insured in the state of Madīnah, especially but not limited to those of a Muslim community. Nonetheless, it further elaborates how a civil government can provide the basic infrastructure, development of roads, religion abodes, supplying clean water, and promotion of peace and harmony among the people, and the rights of minorities in the light of Sīrat-e-Ṭayyibah.

The method used in this article is descriptive and analytical study of the relevant Aḥādith, and building arguments on it. This study concluded that Holy Prophet (ﷺ) led the foundations of the municipality in the State of Madīnah, and the basic needs of food, shelter, clean water. It ensured a peaceful society. Moreover, it is suggested that these aspects and teachings of Sīrat should be blazoned widespread to pave the way for social development, peace and harmony.

Keywords: *Municipality, Social Development, Sīrat Studies, State of Madīnah, Politics*

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ ودینیہ، جامعہ ہری پور

** پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ علوم اسلامیہ ودینیہ، جامعہ ہری پور

تمہید

بلدیہ عوامی نمائندوں کی منتخب جماعت کو کہا جاتا ہے، جس کا تعلق عوامی فلاح و بہبود اور خدمات کی فراہمی کے ساتھ ہو۔ ان خدمات میں صفائی کا انتظام، راستوں اور سڑکوں کی تعمیر، صحت و علاج معالجے کے مراکز کا قیام، اور صاف پانی کی فراہمی کا نظام وغیرہ شامل ہیں۔ ایسے شہری اداروں کو انگریزی میں "میونسپلٹی" کہا جاتا ہے۔

تمام ممالک اپنے شہریوں کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اقدامات اٹھاتے ہیں۔ آئینِ پاکستان ۱۹۷۳ء کے آرٹیکل ۱۴۰/a کے تحت بھی ایسے عوامی اداروں کے قیام کا تذکرہ کیا گیا ہے، جو عوامی خدمات اور سہولیات کو یقینی بنانے میں معاون ہوں۔ بلدیاتی نظام (میونسپلٹی) اور بنیادی عوامی سہولیات کی فراہمی کو عصرِ حاضر میں ترقی کے ناپنے کے پیمانے کے طور پر دیکھا جاتا ہے، اور سہولیات کی فراوانی جتنی زیادہ ہوتی ہے اس شہر، علاقہ کو ترقی یافتہ سمجھا جاتا ہے۔ اس مقالہ میں ریاستِ مدینہ کے بلدیاتی نظام (میونسپلٹی) اور بنیادی عوامی سہولیات کی فراہمی کا جائزہ لیا گیا ہے، اور اس سے عصرِ حاضر کے بلدیاتی نظام اور سہولتوں کی فراہمی کے لیے استنباط کیا گیا ہے۔

اللہ تعالی نے رسول اللہ ﷺ کو پوری اُمت کے لیے بہترین نمونہ بنا کر بھیجا تھا، اور آپ ﷺ کی زندگی کے ہر گوشہ میں اُمت کے لیے عملی رہنمائی موجود ہے۔ آپ ﷺ کی ذاتی اور خانگی طرزِ حیات ایک کامیاب گھریلو زندگی کے لیے بہترین نمونہ ہے، تو تمدن اور اجتماعی طرز زندگی کے لیے سیرت طیبہ میں انسانوں کے ہر طبقہ اور صنف کے لیے واضح ہدایات موجود ہیں۔

دینِ اسلام فقط عبادات ہی کا نام نہیں، بلکہ اس کی تعلیمات اور احکام فرد کی ذاتی زندگی کے ساتھ ساتھ، اس کے معاشرتی تعلقات اور سیاسی و سماجی زندگی کے ساتھ بھی تعلق رکھتے ہیں۔ بلکہ جس ماحول اور علاقہ میں اس کی بود و باش اور سکونت ہو، اس کے متعلق بھی واضح ہدایات فراہم کرتا ہے۔ دینِ اسلام کے اسی ہمہ گیری کی وجہ سے اس کو دیگر ادیان پر امتیاز حاصل ہے اور اس کو دینِ فطرت قرار دیا گیا ہے۔

عوامی خدمات اور سہولتوں کی ایک طویل فہرست ہے، مگر زیرِ نظر مضمون میں بلدیاتی نظام کی طرف سے شہریوں کو فراہم کی جانے والی چیدہ چیدہ سہولیات اور بلدیاتی حکومتوں کی ذمہ داریوں کا تذکرہ کرنے کے بعد اس بات کا جائزہ لیا گیا ہے کہ سیرتِ نبوی ﷺ میں ان امور کے بارے میں کیا رویہ اور رجحان ملتا ہے۔ بلدیاتی حکومت کی چیدہ چیدہ ذمہ داریاں درجِ ذیل ہیں:

- تمام سرکاری اداروں کی کارکردگی کو جانچنا اور ان کی نگرانی کرنا۔
- قوانین پر عملدرآمد کو یقینی بنانا تاکہ امن و امان میں بگاڑ پیدا نہ ہو۔
- اراضی کی پیمائش کرنا، نئی آبادیوں کو بسانے کے لئے عوام کی رہنمائی کرنا اور آبادیوں کو جملہ سہولیات کی فراہمی یقینی بنانا جن میں پانی وغیرہ شامل ہیں۔

- بازاروں کی نگرانی کرنا، اشیاء کی کوالٹی اور قیمتوں پر نظر رکھنا، گراں فروشوں اور ذخیرہ اندوزوں کے خلاف کارروائی کرنا۔
- نئے ترقیاتی منصوبہ جات مثلاً نئی سڑکیں بنانا، کا اجراء کرنا اور پرانے منصوبہ جات کی دیکھ بھال کرنا۔
- شہریوں کے لئے تعلیم کا بندوبست کرنا۔ (تعلیمِ اطفال و تعلیمِ بالغاں)
- قدرتی وسائل کا تحفظ کرنا، مثلاً جنگلات کی حفاظت کرنا وغیرہ۔ (۱)

درج بالا تمام امور کی رعایت رکھنا ایک بلدیاتی حکومت کی ذمہ داری ہے کیوں کہ یہ تمام امور وہ ہیں جن کا ایک فرد کی زندگی سے براہِ راست تعلق ہوتا ہے۔ درج ذیل سیرتِ نبوی میں ان امور کے بارے میں اختیار کی جانے والی تدابیر اور حکمتِ عملیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

مسجد بطورِ مرکز

بلدیاتی نظام میں میونسپل ایڈمنسٹریشن آفس کو مرکزی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اس آفس میں متعلقہ افراد ہر وقت موجود ہوتے ہیں اور انتظامی امور میں درپیش مشکلات کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ تحصیل اور گاؤں کی سطح پر متعدد کمیٹیاں تشکیل دی جاتی ہیں جن کے لئے مختص عمارات کو کمیونٹی سنٹر کا نام دیا جاتا ہے۔ دورِ رسالت ﷺ میں بلدیاتی حکومت کے مرکزی دفتر اور ذیلی کمیونٹی سنٹرز کی مثال مسجد کی صورت میں نظر آتی ہے۔

اسلامی معاشرہ میں مسجد کو ایک کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ عبادت کے ساتھ ساتھ معاشرے کے افراد کے باہمی ربط و تعلق کے لیے مرکزی محور مسجد ہی ہے، جو مادی اور معنوی طور پر معاشرے کے تقویت کا باعث بنتی ہے۔ اسی اہمیت کی وجہ سے مسجد کو دیگر عوامی سہولیات میں سرفہرست رکھا گیا ہے۔

معاشرے کے لیے مسجد کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد سب سے پہلے جو کام سرانجام دیا، وہ مسجد کی تعمیر تھی۔ (۲)

مسجد کی اہمیت کو مزید اجاگر کرنے کے لئے عام مسلمانوں کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ بنفس نفیس مسجد نبوی کی تعمیر میں شریک ہوئے، خود اینٹیں لاتے، سیدنا طلق بن علی رضی اللہ عنہ کو گارا گھولنے کا حکم دیتے (۳)۔

مسجد کی اس اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شہری نظام کی اصلاح کے لیے چند نکات اخذ کئے جاسکتے ہیں:

۱۔ مسجد مروجہ متعدد کمیونٹی سنٹرز کا بہترین نعم البدل ہے، اس کو بیک وقت کئی ایسے مقاصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے، جو معاشرے کی تعمیر و ترقی اور درست سمت میں سفر کے لیے انتہائی ضروری ہیں۔ مسجد

---

(۱) www-lgkp-gov-pk ,Retrieved on May 28, 2018

(۲) ابن ہشام، عبد الملک، السیرۃ النبویۃ، مکتبہ مصطفی البابی، مصر، ۱۳۷۵ھ، ۱/۴۹۴

(۳) ابن سعد، محمد بن سعد، الطبقات الکبری، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۴۱۰ھ، ۱/۱۸۵

جہاں ایک طرف عبادات کے ساتھ تعلیم و تعلم کا ذریعہ بنتی ہے وہیں دوسری جانب لوگوں کی اصلاح کے لیے وعظ و نصیحت اور باہمی ربط و اتفاق کا ذریعہ بھی ہوتی ہے۔(۱)

۲۔ مسجد کے ذریعے معاشرے میں تعاون اور ایک دوسرے کے احوال سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"كانت مواضع الأئمة ومجامع الأمة هي المساجد فإن النبي ﷺ أسس مسجده المبارك على التقوى: ففيه الصلاة والقراءة والذكر وتعليم العلم والخطب وفيه السياسة"(۲)

مساجد مسلم قیادت اور امت مسلمہ کی اجتماع گاہ ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی مبارک مسجد کی بنیاد تقوی پر رکھی، جہاں نماز، تلاوت، ذکر، تعلیم و تعلم، وعظ و نصیحت اور سیاسی سرگرمیاں ہوتیں۔

۳۔ مسجد کی تعمیر میں آپ ﷺ کی عملی شرکت آپ ﷺ کی تواضع، انکساری کا عملی نمونہ ہے، جس میں مسلمانوں کے سربراہان اور بڑوں کے لیے ایک عمدہ ترغیب ہے کہ مسجد کی مادی و معنوی تعمیر میں سب سے کلیدی کردار اُنہی کا ہونا چاہیے۔

موجودہ دور کی ضلعی انتظامیہ کو دیکھا جائے تو اس میں کام کرنے والے افراد کو ان خدمات کا باقاعدہ معاوضہ دیا جاتا ہے جبکہ دورِ رسالت میں ایسا کوئی انتظام نہ تھا بلکہ ان امور کی طرف لوگوں کو راغب کرنے کے لئے ترغیب و تحریض سے کام لیا جاتا تھا اور ان میں احساسِ ذمہ داری پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ ترغیب و تحریض کا یہ پہلو مالی منفعت کے بغیر خدمت کرنے کے جذبے کو ابھارنے کا نہایت عمدہ طریقہ ہے کیونکہ احساسِ ذمہ داری ہی وہ واحد چیز ہے جو کسی بھی معاشرے کو درست سمت میں گامزن رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے نیز دنیاوی منفعت کا حصول پیشِ نظر نہ ہو تو نہ صرف مفادات میں ٹکراؤ کا امکان معدوم ہو جاتا ہے بلکہ معاشرے کی ترقی میں ہر شخص بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے۔

امن وامان کا قیام

کسی بھی معاشرے میں امن وامان کو برقرار رکھنا نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ معاشرہ امن وامان کے بغیر نہیں چل سکتا، بدامنی کے ہوتے ہوئے، کسی بیرونی دشمن کی ضرورت نہیں ہوتی۔ امن و امان کو برقرار رکھنے کے لئے باہمی بھائی چارہ، محبت و اعتماد اور خیر خواہی کی فضا کا ہونا بے حد ضروری ہے کیونکہ جب تک اہلِ علاقہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مخلص نہ ہوں اور ان میں باہمی تعاون نہ ہو، نظام کی کامیابی کے لیے جتنے بھی جتن کئے جائیں، وہ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتے۔(۳)

---

(۱) زیدان، عبدالکریم، ڈاکٹر، فقہ السیرۃ، دار التدمریۃ، سعودی عرب، ۱۴۲۴ھ، ص:۳۳۴

(۲) ابن تیمیہ، احمد بن عبدالعلیم، مجموع الفتاوی، مجمع الملک فہد، سعودی عرب، ۱۴۱۶ھ، ۳۵/۳۹

(۳) فقہ السیرۃ، ص:۳۴۲

باہمی محبت واعتماد اور خیر خواہی کے علاوہ دوسرا بنیادی عنصر مذہبی آزادی اور رواداری ہے تاکہ مختلف عقائد و نظریات کے حامل افراد اپنے اپنے مذاہب پر عمل کرنے میں آزاد ہوں نیز ہر فرد کو اس بات کا یقین ہو کہ اس کی جان اور اس کا مال دونوں محفوظ ہیں۔

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے آنحضرت ﷺ نے دو اقدامات کئے:

- مہاجرین وانصار کے درمیان عقدِ مواخات کیا۔
- یہود اور دیگر غیر مسلم قبائل کے ساتھ معاہدۂ امن کیا۔

امن وامان کے قیام کے لیے پہلا قدم: عقدِ مواخات

عقدِ مواخات کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ مہاجرین اور انصار کے درمیان بھائی چارگی، باہمی اعتماد و محبت اور خیر خواہی کی فضا قائم ہوئی بلکہ بہت سے دیگر مسائل کے حل میں بھی اس کا کردار نمایاں رہا۔ لیکن اس معاہدہ کا اصل مقصد کیا تھا، اس ضمن میں حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"أن هذه المؤاخاة إنما شرعت لأجل ارتفاق بعضهم من بعض وليتألف قلوب بعضهم على بعض"(۱)

اس مواخات کا مقصد یہ تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک دوسرے کی مدد کریں، اور آپس میں قلبی انس و محبت پیدا ہو سکے۔

اسی ضمن میں علامہ سہیلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"آخى رسول الله ﷺ بين أصحابه حين نزلوا المدينة، ليذهب عنهم وحشة الغربة ويؤنسهم من مفارقة الأهل والعشيرة ويشد أزر بعضهم ببعض" (۲)

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ آنے کے بعد اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں مواخات قائم کی، تاکہ اجنبیت کی وحشت اور گھر اور خاندان کے چھوڑنے کی قلق ختم ہو جائے، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپس میں ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔

گویا مواخات کا مقصد باہمی الفت ومحبت کا فروغ اور اجنبیت وناموانوسیت کی دیوار کو گرا کر ایک کر دینا تھا۔ یہی کام بلدیاتی حکومت گلی، محلے کی سطح پر کمیٹیاں یا کمیونٹیز بنا کر کرتی ہے تاکہ معاشرے میں امن اور رواداری قائم رہ سکے۔

سیرتِ طیبہ میں کثیر تعداد میں ایسی روایات موجود ہیں جو باہمی تعاون اور الفت و محبت کی تلقین کرتی ہیں(۳)، جب کہ اِن ہدایات کے برعکس ہمارے معاشرے میں اسی چیز کا فقدان ہے اور معاشرتی فساد کا بنیادی سبب

---

(۱) ابن کثیر، ابوالفداء اسماعیل بن عمر، البدایۃ والنہایۃ، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۰۸ھ، ۳/۲۷۸

(۲) سہیلی، عبد الرحمن بن عبد اللہ، الروض الانف، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۲۱ھ، ۴/۱۷۸

(۳) مثلاً: بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب من الایمان ان یحب لاخیہ مایحب لنفسہ، حدیث نمبر: ۱۳، تحقیق: محمد زہیر بن ناصر، دار الطوق النجاۃ، ۱۴۲۲ھ)

بھی یہی ہے کہ یہاں قوی، کمزور کا حق دباتا ہے، اور دوسروں کے ساتھ تعاون اور بھلائی کرنے کے بجائے، صرف ذاتی خواہشات کی تکمیل میں ساری توانائیاں خرچ ہو جاتی ہیں۔

امن و امان کے قیام کے لیے دوسرا قدم: معاہدۂ امن

رسول اللہ ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے، تو اسلام کے علاوہ دیگر ادیان، بالخصوص یہودی بھی آباد تھے۔ چنانچہ پُرامن معاشرے کے قیام کے لیے آپ ﷺ نے مسلمانوں اور یہودیوں میں باہمی تعلقات قائم کرنے کے لیے ایک تحریری معاہدہ فرمایا۔[۱]

اس معاہدہ میں یہودیوں کو اپنے دین اور اموال پر برقرار رکھا گیا۔ قصاص اور خون بہا کے قدیم طریقوں کو بدستور قائم رکھا گیا۔ جس میں تحریر تھا کہ ظلم اور فساد میں کسی کی رعایت نہیں ہوگی۔ معاہدے کے تمام فریقوں پر لازم ہے کہ وہ مدینہ منورہ میں فساد برپا نہ کریں۔ یہودیوں کی جان و مال کی حفاظت مسلمانوں کے ذمہ ہوگی اور ہر فریق اپنے اخراجات کا خود ذمہ دار ہوگا۔ مدینہ پر حملے کی صورت میں سب باہمی تعاون کریں گے اور ہر فریق دشمن کے مقابلے میں دوسرے کی مدد کرے گا۔[۲]

اِس معاہدے سے شہری نظام کی کامیابی کے لیے مندرجہ ذیل نکات اخذ کئے جاسکتے ہیں:

۱۔ معاشرہ کا ہر فرد بلا تفریق مذہب و نسل اہمیت رکھتا ہے، اور ان تمام افراد کا باہمی تعلقات کو استوار کرنا انتہائی ضروری ہے، چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم۔ اس معاہدے سے ان لوگوں کی غلط فہمی کا بھی ازالہ ہوتا ہے جو اسلام کو صرف عبادات میں منحصر سمجھتے ہیں، حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ آنے کے بعد دیگر عبادات کے قیام سے پہلے معاشرے کے افراد کا باہمی ربط قائم فرمایا۔[۳]

۲۔ اِس معاہدے سے ایک طرف مسلمان یہودیوں کی شرارتوں سے محفوظ رہے، تو دوسری طرف یہودی بھی اِس معاشرے میں امن اور اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اِس معاہدے میں اقلیتوں کے حقوق کی طرف بھی اشارہ ہے۔

۳۔ رسول اللہ ﷺ نے اِس معاہدے میں مسلمانوں اور یہودیوں میں سے ہر ایک پر یہ بات لازم کر دی، کہ بیرونی دشمن کے حملے کی صورت میں ایک فریق دوسرے کے ساتھ تعاون کرے گا۔[۴]

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ، ۳/۲۷۸

(۲) السیرۃ النبویۃ، ۱/۵۰۲-۵۰۴

(۳) فقہ السیرۃ، ص:۳۵۲

(۴) السیرۃ النبویۃ، ۱/۵۰۲- ۵۰۴

شہر کی حفاظت

شہری نظام کی کامیابی کے لیے ضروری ہے، کہ وہاں کے باشندے اندرونی امن کے ساتھ بیرونی دشمن سے بھی محفوظ ہوں، اور ہر شہری اپنے علاقے کی حفاظت کے جذبے سے سرشار ہو۔ اندرونی امن کے قیام کے لئے موجودہ دور میں پولیس کا محکمہ موجود ہے اور اس محکمہ کی معاونت کے لئے دیگر سرکاری ادارے بھی موجود ہیں۔ دورِ رسالت میں اندرونی امن وامان کے قیام کے لئے باقاعدہ پولیس کا محکمہ قائم نہیں تھا کہ وہ لوگوں کے اعمال وافعال کی نگرانی کرتا اور ناقضِ امن معاملات میں ملوث ہونے پر ان پر گرفت کرتا بلکہ ہر شخص انفرادی طور پر اس بات کی کوشش کرتا کہ اس سے کوئی ایسا کام سرزد نہ ہو جائے جو نقضِ امن کا باعث بن کر انتشار پھیلانے والا ہو۔

بیرونی دشمن سے مدینہ کے شہریوں کی حفاظت کے لئے آنحضرت ﷺ نے درج ذیل دو اقدامات کئے:

- یہود کے علاوہ گرد و نواح کے قبائل سے بھی امن کا معاہدہ کیا جس کی رو سے ہر فریق کسی بیرونی حملہ کی صورت میں دوسرے فریق کی مدد کرنے کا پابند تھا۔
- آپ ﷺ بذاتِ خود مدینہ منورہ کا گشت فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک رات اہلِ مدینہ ایک آواز کی وجہ سے ڈر گئے اور لوگ اس آواز کی طرف روانہ ہوئے تو سامنے سے نبی اکرم ﷺ، جو لوگوں سے پہلے ہی اس آواز کے تعاقب میں نکل پڑے تھے، گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر، گلے میں تلوار لٹکائے، یہ کہتے ہوئے تشریف لائے کہ پرواہ مت کرو۔ (۱)

درج بالا واقعہ سے شہریوں کے جان ومال کے تحفظ کا جو تصور ملتا ہے، خلافت راشدہ میں اس کا باقاعدہ اہتمام نظر آتا ہے اور آج کے نظام بلدیات میں اس کے پیشِ نظر شعبہ پولیس کے رات کو گشت کو مزید فعال بنانے کی ضرورت ہے تاکہ امن وامان اور تحفظ جان ومال کو یقینی بنایا جاسکے۔

رہائش اور کھانے کی سہولیات مہیا کرنا

کسی بھی بلدیاتی نظام اور شہری حکومت کے لیے یہ بات ضروری ہے، کہ وہ اپنے باشندوں کے لیے رہائش کا معقول انتظام کرے۔ کیوں کہ جب تک رعایا کو آرام کے ساتھ رہنے کی جگہ میسر نہ ہو، تب تک وہ دوسرے اہم امور کے لیے فارغ نہیں ہوتے۔ بلدیاتی نظام میں رہائش کی فراہمی اس طور پر کی جاتی ہے کہ آبادکاری کے اس عمل میں ایک ترتیب اور نظم برقرار رکھا جائے تاکہ مزید رہائشی منصوبوں کے اجراء کی صورت میں قدیم آبادیوں کو فراہم کردہ سہولیات میں کمی واقع نہ ہو۔ رہائش کی اہمیت کے پیشِ نظر رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے رہائش کا انتظام بھی کیا۔ انصار مقامی باشندے ہونے کی وجہ سے پہلے سے گھروں کے مالک تھے اور

(۱) صحیح بخاری، کتاب الجہاد والسیر، باب الحمائل وتعلیق السیف بالعنق، حدیث نمبر: ۲۹۰۸، تحقیق: محمد زہیر بن ناصر، ۲/۳۹

صاحبِ جائیداد بھی تھے، جبکہ مہاجرین بڑی تعداد میں مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے آئے ہوئے تھے ان کے پاس نہ تو ذاتی گھر تھے اور نہ ہی جائیدادیں۔ (۱)

ہجرتِ رسول ﷺ سے مدینہ منورہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی تو اس میں رہائش اختیار کرنے کی غرض سے آنے والوں میں صرف مہاجرین ہی نہیں تھے بلکہ عرب کے دوسرے قبائل کے لوگ بھی مختلف اطراف سے مدینہ منورہ کی طرف امڈ آئے۔ محدود وسائل کے ساتھ اتنی بڑی تعداد کے لیے رہائش کا انتظام کرنا آسان کام نہیں تھا۔ لیکن آپ ﷺ نے اُن کی رہائش کا ایسا زبردست بندوبست کر دیا جو عمرانیات کے ماہرین کے لیے سیرتِ طیبہ کا انتہائی دلچسپ موضوع ہے۔

اس مسئلے کا حل نکالتے ہوئے آپ ﷺ نے بعض مہاجرین کے لیے ابتدائی رہائش کے طور پر مسجد نبوی میں ایک خیمہ لگایا، جس کو صفہ کہا جاتا تھا، یہ اُن لوگوں کا گھر ہوتا تھا جن کے پاس رہائش کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ (۲)

اصحابِ صفہ کی رہائش کے انتظام کے ساتھ ساتھ اُن کے کھانے کا انتظام بھی رسول اللہ ﷺ کیا کرتے تھے۔ (۳) چنانچہ آپ ﷺ نے بعض مہاجرین کی رہائش کا انتظام کسی مال دار انصاری کے ذمہ لگا دیا تاکہ قیام وطعام دونوں ضروریات بآسانی پوری ہو سکیں اور معاشرے میں توازن برقرار رہے نیز اصحابِ صفہ کو روزانہ رات کے وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان تقسیم فرما دیتے تاکہ ان کے ساتھ کھانا کھا سکیں۔ (۴) نیز آپ ﷺ دوسروں کی مدد کی ترغیب دیتے رہتے۔ ایک مرتبہ فرمایا:

«لَيْسَ الْمُؤْمِنُ الَّذِي يَشْبَعُ، وَجَارُهُ جَائِعٌ إِلَى جَنْبِهِ» (۵)

وہ کامل ایمان والا نہیں ہو سکتا جو خود سیر شکم ہو کر سوئے، جب کہ اس کا پڑوسی بھوکا ہو۔

اس عمل سے آپ ﷺ نے امت کو یہ پیغام دیا کہ معاشرے کے مالدار افراد غریب اور نادار افراد کے لئے نہ صرف رہائش کی فراہمی کے ذمہ دار ہیں بلکہ ان کے کھانے پینے کا بندوبست کرنا بھی ان کی ذمہ داری ہے۔

کھانے کا انتظام اس بات کا بھی تقاضہ کرتا تھا کہ مسلمانوں میں تجارتی سرگرمیوں کو بھی فروغ حاصل ہو۔ اس مقصد کے لئے طویل مدتی منصوبے کے طور پر باقاعدہ بازاروں اور تجارتی مراکز کا قیام عمل میں آیا جس کی تفصیل آئندہ عنوان کے تحت درج کی جارہی ہے۔

---

(۱) الطبقات الکبری، ۱/ ۱۸۴

(۲) ابن عساکر، علی بن حسن، تاریخ دمشق، دار الفکر، بیروت، ۱۴۱۵ھ، ۲/ ۲۸

(۳) ابن اثیر، علی بن ابو الکرم، اسد الغابۃ، دار الفکر، بیروت، ۱۴۰۹ھ، ۲/ ۴۸۰

(۴) حلبی، علی بن برہان الدین، سیرۃ حلبیۃ (اردو)، مترجم: مولانا محمد اسلم قاسمی، دارالاشاعت کراچی، مئی، ۲۰۰۹ء، ۲/ ۲۱۶

(۵) بیہقی، احمد بن حسین، السنن الکبری، کتاب الضحایا، باب صاحب المال لا یمنع المضطر فضلا، حدیث نمبر: ۱۹۶۶۸، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۴۲۴ھ، ۱۰/ ۵

بازاروں اور تجارتی مراکز کا قیام

مدینہ منورہ کی جانب ہجرت کے وقت مدینہ میں تجارت پر یہود کی اجارہ داری تھی اور ان کا اپنا ایک بازار تھا جس کا نام "سوق قینقاع" تھا۔ عقدِ مواخات کے بعد متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس بازار کا رخ کیا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«قَدِمَ عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ عَوْفٍ المَدِينَةَ فَآخَى النَّبِيُّ ﷺ، بَيْنَهُ وَبَيْنَ سَعْدِ بْنِ الرَّبِيعِ الأَنْصَارِيِّ، وَكَانَ سَعْدٌ ذَا غِنًى، فَقَالَ لِعَبْدِ الرَّحْمَنِ: أُقَاسِمُكَ مَالِي نِصْفَيْنِ وَأُزَوِّجُكَ، قَالَ: بَارَكَ اللَّهُ لَكَ فِي أَهْلِكَ وَمَالِكَ، دُلُّونِي عَلَى السُّوقِ»[۱]

عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ جب مدینہ آئے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ اور سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کے درمیان بھائی چارگی قائم کی، تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اُسے اپنا مال اور اہل آدھا آدھا کرنے کے لیے پیش کیا۔ عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ آپ کے اہل اور مال میں برکت عطا فرمائے، مجھے تو بازار کا راستہ دکھاؤ۔ (تاکہ میں اپنے لیے خود کماؤں)۔

حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا اپنے انصاری بھائی سے بازار کا راستہ پوچھنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مہاجرین تجارتی امور اور سرگرمیوں میں حصہ لینے سے غافل نہ تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کی تجارتی اجارہ داری کو ختم کرنے کے لئے الگ سے بازار کا قیام عمل میں لایا۔ ایک روایت کے مطابق:

ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے بازار قائم کرنے کے لئے ایک جگہ دیکھی ہے، کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے دیکھنا پسند فرمائیں گے؟ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیوں نہیں۔ پھر اس کے ساتھ اس جگہ تشریف لے گئے اور وہ جگہ اتنی پسند آئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پاؤں وہاں پر زور زور سے مارتے ہوئے فرمایا: یہی تمہارا بازار ہے، اب تم کوئی کوتاہی نہ کرنا اور نہ ہی اس پر کوئی ٹیکس مقرر کرنا۔[۲]

اس روایت سے بلدیاتی حکومت کی درج ذیل ذمہ داریاں سامنے آتی ہیں:

۱۔ نئے بازار قائم کرنا۔
۲۔ ضرورت کے مطابق تاجروں کو اس بازار کے آباد کرنے کی ترغیب دینا۔
۳۔ نئے قائم کردہ بازار میں ٹیکس نہ لگانا۔

ان تینوں امور کو دیکھا جائے تو یہ بات سمجھ آتی ہے کہ حکومت کے لئے یہ کافی نہیں کہ وہ صرف بازار قائم

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب کیف آخی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بین اصحابہ، حدیث نمبر: ۳۹۳۷، ۵/ ۶۹
(۲) طبرانی، سلمان بن احمد بن ایوب، المعجم الکبیر، حدیث نمبر: ۵۸۶، باب المیم، الزبیر بن ابی اسید عن ابیہ، تحقیق: حمدی بن عبد المجید، مکتبہ ابن تیمیہ، قاہرہ، طبع دوم: ۱۹۹۴ء

کر دے بلکہ اس پر لازم ہے اس بازار کو آباد کرنے کے لئے تاجروں کو سہولیات بھی فراہم کرے۔ ٹیکس نہ لگانا تاجروں کو فراہم کی جانے والی سہولیات میں سے ایک اہم سہولت ہے کیونکہ ٹیکس نہ ہونے کی وجہ سے تاجر اس بازار میں بغیر کسی خوف اور ڈر کے تجارتی سرگرمیاں سرانجام دیں گے۔

معیاری اشیاء کی فراہمی

انسانی زندگی کا تحفظ مقاصدِ شریعت میں سے بنیادی مقصد ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے اسلام کی تعلیم انتہائی سادہ ہے۔ «المسْلِمُ مَنْ سَلِمَ المسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ»[1] کا ارشادِ نبوی تمام دقیق اور گنجلک ابحاث اور فلسفوں کو نہایت مختصر الفاظ میں بیان کر دیتا ہے اور زبان اور ہاتھ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچانے کو اصل ایمان قرار دیتا ہے۔

کھانے پینے کی اشیاء کا ملاوٹ سے پاک بالکل خالص صورت میں افراد تک پہنچایا جانا، تعلیماتِ نبوی ﷺ کا اصل منشا ہے۔ اس بارے میں آنحضرت ﷺ کا طرزِ عمل درج ذیل حدیث سے واضح ہو جاتا ہے:

«أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ مَرَّ عَلَى صُبْرَةٍ مِنْ طَعَامٍ، فَأَدْخَلَ يَدَهُ فِيهَا، فَنَالَتْ أَصَابِعُهُ بَلَلاً، فَقَالَ: يَا صَاحِبَ الطَّعَامِ، مَا هَذَا؟ قَالَ: أَصَابَتْهُ السَّمَاءُ يَا رَسُولَ اللهِ، قَالَ: أَفَلاَ جَعَلْتَهُ فَوْقَ الطَّعَامِ حَتَّى يَرَاهُ النَّاسُ، ثُمَّ قَالَ: مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنَّا»[2]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ غلہ کے ایک ڈھیر کے پاس سے گزرے اور اس ڈھیر میں اپنا ہاتھ داخل کیا تو انگلیوں میں نمی کو محسوس کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اے غلہ والے! یہ کیا ہے؟ اس نے کہا: اے اللہ کے رسول! اس ڈھیر پر بارش پڑ گئی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تو نے اسے غلہ کے اوپر کیوں نہیں رکھا تا کہ لوگ بھی اسے دیکھ لیتے۔ پھر ارشاد فرمایا: دھوکہ دینے والا ہم میں سے نہیں ہے۔

اس روایت سے دو امور کا استنباط کیا جا سکتا ہے:

۱۔ بازار میں فروخت کی جانے والی اشیاء کی جانچ پڑتال کرنا درست ہے۔

۲۔ اسلام میں دھوکہ دہی اور فراڈ کرنے کی اجازت بالکل نہیں ہے۔

بازار میں اشیاء کی جانچ پڑتال کرنا کس کی ذمہ داری ہے؟ اس بارے میں ظاہر سی بات ہے کہ حکومتِ وقت یا اس کی طرف سے مقرر کردہ کوئی فرد ہی اس کا ذمہ دار ہو سکتا ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ کی ذاتِ عالیہ اپنی حیاتِ

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ، حدیث نمبر:۱۰

(۲) قشیری، مسلم بن الحجاج، صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب قول النبی ﷺ: «من غشنا فلیس منا» حدیث نمبر:۱۰۲، تحقیق: محمد فواد عبد الباقی، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ترمذی، محمد بن عیسیٰ، سنن ترمذی، ابواب البیوع، باب ما جاء فی کراہیۃ الغش فی البیوع، حدیث نمبر:۱۳۱۵، تحقیق: بشار عواد معروف، دار الغرب الاسلامی، بیروت، ۱۹۹۸ء

مبارکہ میں مسلمانوں کے تمام معاملات میں ذمہ دار تھی اور آپ ﷺ کا بازاروں میں جانا اور وہاں پر فروخت ہونے والی اشیاء کی جانچ پڑتال کرنا بحیثیت حکمران تھا۔ موجودہ دور میں یہ ذمہ داری حکومت کی طرف سے مقرر کردہ عامل یا افسر کی ہے کہ بازار میں جائے اور وہاں پر موجود اشیاء کا جائزہ لے اور اس امر کو یقینی بنائے کہ عوام تک پہنچنے والے اشیائے خوردنی بغیر کسی ملاوٹ کے پہنچ رہی ہیں۔

«مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنَّا» کے الفاظ عام ہیں اور اس میں دھوکہ دہی کی تمام صورتیں شامل ہو جاتی ہیں جن میں عیب دار اشیاء کو فروخت کرنا، جھوٹی قسمیں کھا کر فروخت کرنا، عمدہ چیز دکھا کر گھٹیا چیز دے دینا، اشیاء کی معیادی تاریخ (Expiry Date) ختم ہونے پر تاریخ کو مٹا دینا یا اس پر نئی تاریخ لگا کر فروخت کر دینا، ناپ تول میں کمی کر دینا وغیرہ شامل ہیں۔ دھوکہ دہی کی یہ تمام صورتیں ایسی ہیں جن میں سے ہر ایک کے بارے میں قرآن و سنت سے مستقلاً دلائل موجود ہیں۔

دوسری بات جس کی طرف اس حدیث میں اشارہ نہیں ہے وہ یہ ہے کہ آیا دھوکہ دہی کے مرتکب شخص کو اس پر کوئی سزا بھی دی جائے گی یا نہیں؟ حدیث اس بارے میں خاموش ہے۔ لیکن ظاہر سی بات ہے کہ حاکمِ وقت کو اگر مصالحِ عامہ اور مفادِ عامہ کی رعایت رکھنی ہے تو اسے اس بات کا اختیار بھی ہے کہ وہ دھوکہ دہی سے بچاؤ کی ہر ممکنہ صورت اختیار کرے جس میں فراڈ کرنے والوں کو سزا دینا بھی شامل ہے۔

دھوکہ سے بچنے کی کیا صورت ہو گی؟ اس بارے میں آنحضرت ﷺ کی ایک اور حدیث سے رہنمائی ملتی ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِذَا تَبَايَعَ الرَّجُلَانِ فَكُلُّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا بِالْخِيَارِ مَا لَمْ يَتَفَرَّقَا»[1]

جب دو آدمی خرید و فروخت کا معاملہ کریں تو ان میں سے ہر ایک کو اس وقت تک اختیار حاصل ہے جب تک وہ جدا نہ ہو جائیں۔

قیمتوں کو کنٹرول کرنا

بازاروں میں اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ اور کمی ہونا ایک لازمی امر ہے جس سے بچنا ممکن نہیں ہے لیکن اگر قیمتوں میں اتنا اضافہ کر دیا جائے کہ وہ اشیاء عام شخص کی قوتِ خرید سے باہر ہو جائیں یا مارکیٹ میں مصنوعی قلت پیدا کر کے قیمتوں کو بڑھا دیا جائے تو حکومت اس میں مداخلت کر کے قیمتوں کو مقرر کر سکتی ہے۔ قیمتوں کو مقرر کرنا "تسعیر" مستقل بحث کا متقاضی ہے، یہاں صرف اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ سیرتِ طیبہ میں قیمتوں کو مقرر کرنے کے بارے میں دو طرح کی روایات ملتی ہیں، کچھ روایات میں قیمتوں کو مقرر کرنے کی بظاہر ممانعت معلوم ہوتی ہے جیسے:

«غَلَا السِّعْرُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ، فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ! سَعِّرْ

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب البیوع، باب ثبوت خیار المجلس للمتبایعین، حدیث نمبر: ۱۵۳۱

لَنَا،فَقَالَ:"إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمُسَعِّرُ القَابِضُ البَاسِطُ الرَّزَّاقُ وَإِنِّي لَأَرْجُو أَنْ أَلْقَى رَبِّي وَلَيْسَ أَحَدٌ مِنْكُمْ يَطْلُبُنِي بِمَظْلِمَةٍ فِي دَمٍ وَلَا مَال» (۱)

نبی ﷺ کے زمانے میں قیمتیں بڑھ گئیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ ہمارے لئے قیمتیں مقرر فرمادیں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یقینا اللہ تعالی قیمتیں مقرر فرمانے والا ہے، تنگی و کشادگی کرنے والا ہے، بہت زیادہ رزق عطا کرنے والا ہے، اور میں امید کرتا ہوں کہ میں اپنے رب سے اس حالت میں ملوں کے تم میں سے کوئی بھی ایسا نہ ہو جو مجھ سے مال اور خون کے ظلم کے بارے میں طلب کرنے والا ہو۔

البتہ مصنوعی گرانی کے وقت قیمتیں مقرر کرنے کی طرف روایات میں اشارہ ملتا ہے، جیسے کہ ایک حدیث میں ہے:

«مَنْ أَعْتَقَ شِرْكًا لَهُ فِي عَبْدٍ، فَكَانَ لَهُ مَالٌ يَبْلُغُ ثَمَنَ العَبْدِ قُوِّمَ العَبْدُ عَلَيْهِ قِيمَةَ عَدْلٍ، فَأَعْطَى شُرَكَاءَهُ حِصَصَهُمْ، وَعَتَقَ عَلَيْهِ العَبْدُ، وَإِلَّا فَقَدْ عَتَقَ مِنْهُ مَا عَتَقَ» (۲)

وہ شخص جس نے غلام میں سے اپنا حصہ آزاد کر دیا (تو دیکھا جائے گا) اگر اس کے پاس اتنا مال ہے جو غلام کی قیمت کو کفایت کر جاتا ہے، تو غلام کی قیمت لگوائی جائے گی اور ہر شریک کو اس کے حصے کے بقدر اس مال میں سے قیمت ادا کر دی جائے گی اور غلام آزاد تصور ہو گا و گرنہ غلام صرف اُسی کی جانب سے آزاد ہو گا اور باقیوں کی جانب سے اس کی عبدیت برقرار رہے گی۔

درج بالا حدیث میں عتاق کے ایک مسئلہ کی صورت بیان کی گئی ہے۔ وجہ استدلال یہ ہے کہ روایت میں مالک کو زائد قیمت وصول کرنے کا حق نہیں دیا گیا جو درحقیقت تسعیر ہی ہے۔

الغرض اشیائے ضروریہ کا مناسب قیمتوں میں ملنا ہر فرد کا حق ہے، کوئی بھی شخص کسی سے یہ حق نہیں چھین سکتا۔ اگر بازار میں مہنگائی پیدا کر دی جائے تو اس کے اصل اسباب کو جان کر ان کا ازالہ کرنا حکومتِ وقت کی ذمہ داری ہے۔ نیز یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ حکومتی سرگرمی کی وجہ سے آئندہ کے لئے بھی گراں فروشی کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ چند تاجروں کو نفع پہنچا کر ہزاروں لوگوں کو تکلیف میں مبتلا کرنا کسی بھی طرح قرینِ انصاف نہیں ہے۔ البتہ بازاروں میں اگر قدرتی عوامل کی بناء پر اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہو رہا ہے تو اس میں مداخلت کرنا درست نہیں لیکن اگر مصنوعی طور پر قیمتوں میں اضافہ کیا جائے تو اس میں مداخلت کرنا حکومتی فریضہ ہے۔

---

(۱) سنن ترمذی، ابواب البیوع، باب ما جاء فی التسعیر، حدیث نمبر:۱۳۱۴۔ ایسی روایت مصنف عبد الرزاق میں بھی موجود ہے، صنعانی، عبدالرزاق بن ہمام بن نافع، المصنف، حدیث نمبر:۱۴۸۹۹، کتاب البیوع، باب: ھل یسعر؟، تحقیق: حبیب الرحمن اعظمی، المجلس العلمی، انڈیا، طبع دوم:۱۴۰۳ھ

(۲) صحیح بخاری، حدیث نمبر:۲۵۲۲، ۳/۱۴۴

ذخیرہ اندوزی کی ممانعت

مصنوعی گرانی کے عوامل میں سے ایک سبب ذخیرہ اندوزی بھی ہے جس کی شناعت اور ممانعت احادیث میں وارد ہوئی ہے۔ احادیث میں ذخیرہ اندوز کو خطاکار کہا گیا ہے۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

«لَا يَحْتَكِرُ إِلَّا خَاطِئٌ»[1]

ذخیرہ اندوزی صرف خطاکار ہی کرتا ہے۔

ایک روایت میں ذخیرہ اندوزی کرنے والے کے افلاس و غربت اور جذام جیسی مہلک بیماری میں مبتلا ہونے کی وعید مذکور ہے[2] جبکہ ایک اور روایت میں چالیس دن تک ذخیرہ اندوزی کرنے والے سے اللہ کی براءت کا تذکرہ ہے[3]۔ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کو ذخیرہ اندوزی کی روک تھام کے لیے اقدامات کرنے چاہیے تاکہ شہریوں کو اس کے نقصانات سے بچایا جاسکے۔

پینے کے لیے صاف پانی کا انتظام

پانی انسانی زندگی کی بنیادی ضرورت ہے اس لیے شہری نظام میں اربابِ اختیار کے لیے ضروری ہے، کہ وہ لوگوں کے لیے صاف پانی کا انتظام کریں۔ آیت ﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾[4] کے مطابق پانی کو انسانی حیات کی بقا کا اساسی ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے آپ ﷺ نے اہلِ مدینہ کے لیے صاف پانی کی فراہمی کا انتظام کرنے کا ارادہ فرمایا تو نظر انتخاب مدینہ منورہ میں ایک یہودی کے کنویں پر پڑی جس کا نام "رومہ" تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مدینہ میں صاف اور میٹھے پانی کا واحد ذریعہ یہی کنواں تھا۔ آپ ﷺ نے ایک دن فرمایا:

«مَنْ يَشْتَرِي بِئْرَ رُومَةَ، فَيَكُونُ دَلْوُهُ فِيهَا كَدِلاَءِ الْمُسْلِمِينَ»[5]

بیرِ رومہ کون خرید لے گا؟ (تاکہ پھر وہ اُس کے لیے خاص نہ ہو)، بلکہ دوسرے مسلمان بھی اُس میں برابر کے شریک ہو۔

آپ ﷺ کے کہنے پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہ کنواں بیس ہزار درہم میں خرید لیا، اور نہ صرف مسلمانوں کے پینے کے لیے وقف کر دیا بلکہ مدینہ کے دیگر باشندوں کو بھی اس سے اپنی ضرورت پوری کرنے کی عام اجازت تھی[6]۔

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب تحریم الاحتکار فی الاقوات، حدیث نمبر: ۱۶۰۵

(۲) «مَنِ احْتَكَرَ عَلَى الْمُسْلِمِينَ طَعَامَهُمْ، ضَرَبَهُ اللهُ بِالْإِفْلاسِ، أَوْ بِجُذَامٍ»، احمد بن حنبل، مسند احمد، مسند عمر بن الخطاب، حدیث نمبر: ۱۳۵، مسند الخلفاء الراشدین، تحقیق: شعیب ارنؤوط، مؤسسۃ الرسالۃ بیروت، طبع اول: ۲۰۰۱ء

(۳) مسند احمد، مسند المکثرین من الصحابۃ، مسند عبداللہ بن عمر، حدیث نمبر: ۴۸۸۰

(۴) سورۃ الانبیاء: ۳۰

(۵) صحیح بخاری، کتاب المساقاۃ، باب فی الشرب، ۳/۱۰۹

(۶) حلبی، علی بن ابراہیم، السیرۃ الحلبیۃ، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۴۲۷ھ، ۲/۱۰۴

صرف صاف پانی کی فراہمی تک ہی یہ معاملہ محدود نہیں رہتا بلکہ ایسے انتظامات کرنا کہ پانی کی فراہمی کا یہ سلسلہ جاری وساری رہے اور پانی مضرِ صحت بھی نہ بنے، بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس مقصد کی غرض سے آپ ﷺ نے پانی کو غلاظت اور گندگی سے پاک رکھنے کی ہدایات بھی دی ہیں۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

«لاَ يَبُولَنَّ أَحَدُكُمْ فِي المَاءِ الدَّائِمِ الَّذِي لاَ يَجْرِي»[1]

تم میں سے کوئی بھی ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب نہ کرے۔

ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کی ممانعت کی وجہ بیان کرتے ہوئے ابن بطال رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

آپ ﷺ نے ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے پر زجر اس وجہ سے کی ہے کہ کہیں پانی خراب نہ ہو جائے اور لوگوں کی صاف پانی تک رسائی دشوار نہ ہو۔[2]

نیز آپ ﷺ نے دیگر ارشادات میں پانی کی فراہمی کی ترغیب دی اور اس کو ان صدقہ جاریہ میں شمار فرمایا جس کا ثواب انسان کی موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔

سیوریج سسٹم

انسانی طبعی حوائج میں پیشاب پاخانہ کی حاجت بھی شامل ہے، جس کے لیے ایک کار آمد سیوریج سسٹم کا نظام از حد ضروری ہے تاکہ بول وبراز کے تعفن اور اس کی گندگی سے رہائشی آبادیوں کو بچایا جاسکے۔

سیرتِ طیبہ ﷺ میں قضائے حاجت کے بارے میں آنحضرت ﷺ کی تعلیمات کے دو پہلو ہیں:

پہلا پہلو آپ ﷺ کا اس بارے میں ذاتی طرزِ عمل ہے اور دوسرا پہلو وہ آداب وتعلیمات ہیں جو آپ ﷺ نے امتِ مسلمہ کو سکھائے ہیں۔

اس بارے میں آپ ﷺ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ آپ ﷺ قضائے حاجت کی خاطر آبادی سے دور تشریف لے جاتے تھے[3] اور قضائے حاجت کے لئے نرم اور نشیبی زمین کا انتخاب فرماتے تھے[4]۔

اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انسانی فضلے کو ڈمپ کرنے کا نظام آبادی سے دور ہونا چاہیے نیز ایسی زمین کا انتخاب کرنا چاہیے جس میں ان فضلہ جات کو جذب کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ قدیم دور میں انسان خود آبادی سے دور جاتا تھا جبکہ آج کے دور میں سیوریج سسٹم کی پائپ لائنز کے ذریعے انسانی فضلے کو آبادی سے دور لے جا کر تلف کرنے کا انتظام کیا جاتا ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الوضوء، باب البول فی الماء الدائم، حدیث نمبر:۲۳۹

(۲) ابن بطال، علی بن خلف، تحقیق: ابو تمیم یاسر بن ابراہیم، مکتبۃ الرشد، السعودیۃ، ریاض، طبع دوم:۲۰۰۳ء، ۱/۳۵۳

(۳) ابوداود، سلیمان بن اشعث، سنن ابو داود، کتاب الطھارۃ، باب التخلی عند الخلاء، حدیث نمبر:۲، تحقیق: محمد محیی الدین عبد الحمید، المکتبۃ العصریۃ، صیدا، بیروت

(۴) سنن ابو داؤد، کتاب الطھارۃ، باب الرجل یتبوأ لبولہ، حدیث نمبر:۳)

انسانی آبادی کو اس تعفن و گندگی سے بچانے کے لیے آنحضرت ﷺ نے امتِ مسلمہ کو براہ راست احکامات بھی ارشاد فرمائے ہیں جن میں درج ذیل تین مقامات پر قضائے حاجت نہ کرنے کی ہدایات دی گئی ہیں:

- راستوں میں۔
- سایہ دار جگہوں میں۔
- موارد یعنی ایسی جگہ جہاں پانی کا انتظام ہو اور لوگوں کی آمد و رفت لگی رہتی ہو۔

آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«اتَّقُوا اللَّعَّانَيْنِ،قَالُوا:وَمَا اللَّعَّانَانِ يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ:"الَّذِي يَتَخَلَّى فِي طَرِيقِ النَّاسِ، أَوْ فِي ظِلِّهِمْ»[1]

دو لعنت کا سبب بننے والی چیزوں سے بچو، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا اے اللہ کے رسول ﷺ دو لعنت کا سبب بننے والی کیا چیزیں ہیں؟ فرمایا: لوگوں کے راستے میں پیشاب کرنا یا ان کی سایہ دار جگہوں میں پیشاب کرنا۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

«اتَّقُوا الْمَلَاعِنَ الثَّلَاثَةَ: الْبَرَازَ فِي الْمَوَارِدِ، وَقَارِعَةِ الطَّرِيقِ، وَالظِّلِّ»[2]

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تین لعنت والی جگہوں سے بچو، گھاٹ پر پاخانہ کرنا، راستوں پر اور سایہ دار جگہ میں پیشاب کرنا۔

لہذا سیوریج سسٹم کی پائپ لائنز بچھانے میں اس بات کو ملحوظ رکھنا بے حد ضروری ہے کہ ان کا گزر صاف پانی کے چشموں، نہروں یا پائپ لائنز کے قریب سے نہ ہو کیونکہ سیوریج کے اثرات اس پانی میں منتقل ہونے کے اندیشہ کا خدشہ موجود ہے نیز عام شاہراہوں میں بچھائی جانے والی پائپ لائنز میں بھی اس بات کو ملحوظ رکھا جائے کہ ان میں کسی وقتی خرابی کی وجہ سے عام لوگوں کو کسی تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

شاہراہوں اور راستوں کا انتظام

ملکی ترقی کے اسباب میں سے ایک اہم سبب کشادہ سڑکیں اور شاہراہیں ہے۔ جدید دنیا میں مواصلات کی ترقی کی وجہ سے شاہراہوں کی اہمیت مزید بڑھ گئی ہے۔ رش اور ازدحام کو ختم کرنے کے لیے مختلف تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں۔ آپ ﷺ نے مدینہ منورہ کی تعمیر اور ترقی کے لیے راستوں سے رکاوٹیں ختم کرنے کا حکم دیا، اور لوگوں کو راستوں میں کھڑا ہونے سے منع فرمایا۔

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الطھارۃ، باب النھی عن التخلی فی الطرق والظلال، حدیث نمبر:۲۶۹

(۲) سنن ابو داود، کتاب الطھارۃ، باب المواضع التی نھی النبی ﷺ عن البول فیھا، حدیث نمبر:۲۶

آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ایک مرتبہ فرمایا:

کہ جب تمہارا آپس میں راستے پر اختلاف ہو، تو راستے کی چوڑائی سات گز رکھا کرو۔(۱)

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

یہ حکم اِس لیے دیا، تاکہ گزرنے والوں کو تکلیف نہ ہو۔(۲)

مصروف راستوں کو بند کرنا، اور اُن میں رکاوٹیں کھڑی کرنے سے بھی آپ ﷺ نے منع فرماتے۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم راستوں میں بیٹھتے تھے، آپ ﷺ نے انہیں منع فرمایا:

«إِيَّاكُمْ وَالجُلُوسَ عَلَى الطُّرُقَاتِ»(۳) خبردار! راستوں میں مت بیٹھو۔

آپ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو راستوں کو کشادہ اور کارآمد رکھنے کی ترغیب دینے کے لیے اِس عمل کی فضیلت بھی بیان فرماتے تھے، ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:

«لَقَدْ رَأَيْتُ رَجُلًا يَتَقَلَّبُ فِي الجَنَّةِ، فِي شَجَرَةٍ قَطَعَهَا مِنْ ظَهْرِ الطَّرِيقِ، كَانَتْ تُؤْذِي النَّاسَ»(۴)

میں نے جنت میں ایک آدمی کو مزے کرتے ہوئے دیکھا، کیوں کہ اُس نے راستے سے ایسے درخت کو کاٹا تھا، جو لوگوں کی تکلیف کا باعث تھا۔

اِس حدیث سے بلدیاتی نظام کا یہ اہم نکتہ بھی ثابت ہوتا ہے، کہ شہر میں جگہ جگہ ناجائز تصرفات پر پابندی ہونی چاہیے، اور ناجائز تصرفات کی صورت میں نہ صرف اُن کو ہٹانا چاہیے بلکہ ایسا کرنے والے افراد کے خلاف تادیبی کارروائی بھی کی جاسکتی ہے۔

فقہاء کرام کا اِس بات پر اتفاق ہے، کہ شارعِ عام میں ایسے تصرفات کرنا ناجائز ہے، جو گزرنے والوں کے تکلیف کا سبب بنیں۔(۵)

شہر کی صفائی کا انتظام

ہر علاقہ میں شہروں کی صفائی کا اہتمام کیا جاتا ہے، بلکہ اِس مقصد کے لیے مستقل مہم چلائی جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ کے گلی کوچوں کی صفائی کا بھی انتظام کیا ہوا تھا، اور اِس مقصد کے لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب المظالم والغصب، باب اذا اختلفوا فی الطریق المیتاء، حدیث نمبر:۲۴۷۳

(۲) عینی، محمود بن احمد، عمدۃ القاری، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۳/ ۲۴

(۳) صحیح بخاری، کتاب المظالم والغصب، باب افنیۃ الدور والجلوس فیھا، حدیث نمبر:۲۴۶۵، ۳/ ۱۶۵

(۴) صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب فضل ازالۃ الاذی عن الطریق، حدیث نمبر:۱۹۱۴

(۵) الموسوعۃ الفقھیۃ الکویتیۃ، دار السلاسل، کویت، ۱۴۰۴ھ، ۲۸/ ۳۵۰

مستقل ترغیب دیا کرتے تھے، بلکہ اِس کو ایمان کا شعبہ قرار دیا۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

«الْإِيمَانُ بِضْعٌ وَسَبْعُونَ–أَوْ بِضْعٌ وَسِتُّونَ–شُعْبَةً، فَأَفْضَلُهَا قَوْلُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ، وَأَدْنَاهَا إِمَاطَةُ الْأَذَى عَنِ الطَّرِيقِ، وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْإِيمَانِ»(۱)

ایمان کے ۷۰ یا کچھ ۶۰ یا کچھ شعبے ہیں۔ سب سے افضل توحید کا اقرار ہے، اور سب سے ادنی راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹانا ہے، اور حیاء بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے۔

ابن بطال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"إماطة الأذى وكل ما يؤذى الناس فى الطرق مأجور عليه"(۲)

گندگی اور لوگوں کے لئے تکلیف کا باعث بننے والی ہر چیز کو راستے سے ہٹانا باعثِ اجر ہے۔

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے راستوں سے گندگی ہٹانے کو صدقہ قرار دیا ہے۔(۳) ایک مرتبہ ابوبرزہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول مجھے کوئی نفع بخش عمل سکھائیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: مسلمانوں کے راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹایا کرو۔(۴)

شہری نظام میں اربابِ اختیار پر لازم ہے کہ وہ راستوں سے ایسی اشیاء جو لوگوں کی تکلیف کا باعث بنے، کو ہٹانے کا انتظام کریں۔ بلدیاتی نظام میں اِس مقصد کے لیے مستقل صفائی والے مقرر ہوتے ہیں لیکن رسول اللہ ﷺ نے اِس کام کے لیے ہر شہری کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے، اور ایسا کرنے کو صدقہ قرار دیا۔ علامہ مناوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"وفيه فضل إزالة الأذى من الطريق كشجر وغصن يؤذي وحجر يتعثر به أو قذر أو جيفة وذلك من شعب الإيمان"(۵)

اِس حدیث میں راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹانے کی فضیلت ہے، جیسے درخت، تکلیف دہ کانٹا، پتھر جس سے لوگ ٹھوکر کھائیں، گندگی یا مردار۔ اور یہ ایمان کے حصوں میں سے ہے۔

نتائج بحث

اِس مقالہ سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں:

۱۔ عصرِ حاضر میں بنیادی شہری حقوق یا بلدیاتی نظام (میونسپلٹی) کے عنوان سے جو سہولیات حکومت کی ذمہ

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب شعب الایمان، حدیث نمبر: ۳۵، ۱/ ۶۳

(۲) ابن بطال، علی بن خلف، شرح صحیح البخاری، مکتبۃ الرشد، سعودی عرب، ۱۴۲۳ھ، ۶ / ۶۰۰

(۳) صحیح بخاری، کتاب المظالم والغصب، باب اماطۃ الاذی، ۳/ ۱۳۳

(۴) ابن ماجہ، محمد بن یزید قزوینی، سنن ابن ماجہ، کتاب الادب، باب اماطۃ الاذی عن الطریق، حدیث نمبر: ۳۶۸۱، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۲/ ۴۹۱

(۵) مناوی، زین الدین محمد عبد الروف، فتح القدیر شرح الجامع الصغیر، المکتبۃ التجاریۃ الکبری، مصر، ۱۳۵۶ھ، ۵/ ۲۷۹

داری میں شمار کی جاتی ہیں، اُن کی فراہمی اور فروغ عصرِ نبوی ﷺ ہی میں مدینہ منورہ کے قیام کے ساتھ کردی گئی تھیں۔

۲۔ مساجد کا قیام اور نظم و نسق حکومت کے اولین فرائض منصبی میں سے ہے۔

۳۔ معاشرے کے تمام افراد میں بلا تفریق مذہب و نسل باہمی تعاون، بھائی چارہ اور فلاح و بہبود کا فروغ، کامیاب بلدیاتی نظام کا ضامن ہے۔

۴۔ نبی اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ کے باشندوں کے لیے کھانے، پینے اور رہائش کا انتظام کرکے، شہریوں کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کی عملی مثال قائم فرمائی۔

۵۔ لوگوں کی معاشی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لئے نئے بازاروں کا قیام بے حد ضروری ہے لیکن ان بازاروں کے قیام سے پہلے ان کے لئے مناسب جگہ کو ڈھونڈا جائے اور پھر اس کو آباد کرنے کے لئے تاجروں کو سہولیات بھی فراہم کی جائیں۔

۶۔ پانی کی ضرورت کو پورا کیا جائے تو اس میں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ فراہم کردہ پانی میں گندگی اور نجاست کا حلول نہ ہونے پائے کیونکہ اس سے بیماریاں پھیلنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

۷۔ سیوریج لائنز بچھا کر ان کے گٹر آبادی سے دور بنائے جائیں اور ان کے لئے ایسی جگہ کا بندوبست کیا جائے جہاں پر وہ جذب ہوسکیں تاکہ بدبو اور تعفن فضا میں آلودگی پھیلانے کا باعث نہ بن سکے۔

۸۔ راستوں اور شاہراؤں کو کشادہ اور صاف رکھنا، نیز ان سے تجاوزات اور تکلیف دہ چیزوں کو ہٹانے کے لیے سیرتِ طیبہ میں واضح ہدایات دی گئی ہیں، اور عصر حاضر میں ان تعلیمات کو فروغ دینے سے متعلقہ مسائل کو کم کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

۹۔ دور نبوی میں انسانی فلاح و بہبود کے تمام کاموں کے انجام دہی کے لئے مساجد کا استعمال ایک طرف سادگی کی طرف اشارہ ہے تو دوسری طرف ان تمام امور کو سرانجام دینا عبادت بھی ہے۔

❁ ❁ ❁

اسلامی ریاست میں قیادت کے راہنما اصول (اسلامی تعلیمات کی روشنی میں)

Principles of Leadership in Islamic State (In the Light of Islamic Teachings)

ڈاکٹر نور حیات خان*

ABSTRACT

Islamic state is responsible to provide the means of protection for its inhabitants. It is the religious and spiritual duty of Islamic state to protect the Islamic culture and civilization as well so that the Muslims could perform their religious and social duties freely. Likewise, an Islamic state is supposed to ensure justice into the society. It indicates that establishing an Islamic state is core responsibility of Muslims so that they could practice their religion in free atmosphere and religious leadership. In this connection, the purpose of this research paper was to explore the principles of leadership in an Islamic state. The qualitative and descriptive research methodology was employed for the collection and analysis of data. The review of literature revealed that Muslim scholars have given particular emphasized on establishing the Islamic state. Moreover the jurists have counted the essential qualities in Islamic leadership. In this context, this article has dealt with the ideal principles which are necessary for the Islamic leadership. These principles are extracted from Qur'ān, Sunnat and life of Holy Prophet (ﷺ).

Key words: *Islamic state, habitant, establishment, Muslim Ummah, leadership, responsibility, guiding principles.*

* ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ علومِ اسلامیہ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، پاکستان

دنیا میں موجود مسلم ریاستوں کے اندر اضطرابی کیفیت پائی جاتی ہے کیونکہ ان میں رعایا کے حقوق کو تحفظ فراہم نہیں کیا گیا۔ اس کی وجوہات اور کمزوریاں کیا ہیں؟ اور وہ کون کون سے اصول ہیں؟ جن کا پاس ولحاظ نہیں رکھا جاتا، جس کی وجہ سے ان ریاستوں کو ہمہ جہت سماجی و تہذیبی اور اخلاقی و سیاسی چیلنجز درپیش ہیں، جس کی جہ سے رعایا اضطرابی کیفیت سے دوچار ہے۔

چونکہ اسلامی ریاست مسلمانوں کے تحفظ کا ذریعہ ہے، اس لیے اس کا قیام ایک ناگزیر عمل ہے۔ قرآن و سنت کی تعلیمات کی روشنی میں امت مسلمہ پر جو اجتماعی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، ان کو پورا کرنا ریاست کی اولین ذمہ داری ہے تاکہ امت کی اخلاقی اور تہذیبی اقدار کی حفاظت ہو سکے۔ اس مقصد کے لیے اسلامی ریاست میں احتساب کے ادارے کا قیام لازمی ہے۔ امت اور ریاست کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور ہر ایک اپنے قیام کے لیے دوسرے کی مرہون منت ہے۔ امت کے بغیر ریاست، اور ریاست کے بغیر امت کا تصور بے کار ہے۔ اسی وجہ سے اکثر متکلمین کے نزدیک اسلامی ریاست کا قیام صرف معاشرتی ہی نہیں بلکہ ایک مذہبی فریضہ بھی ہے۔ لہذا اس کی قیام کی ذمہ داری مجموعی طور پر تمام مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے، جہاں وہ اپنے خالق و مالک کے بتائے ہوئے نظامِ زندگی کو اجتماعی مفادِ عامہ کے لیے بروئے کار لاسکیں۔ اس نظامِ اجتماع کو قرآن مجید میں دین کا نام دیا گیا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾ [1] اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔

اسلام کے علاوہ مسلمانوں کے لیے کوئی اور نظام قابلِ قبول نہیں ہو سکتا کیونکہ ان کا طرزِ معاشرت ہی جداگانہ ہے۔ جس میں خود ساختگی، پیوندکاری کی اجازت نہیں۔ [2] یہ نظام جامع ہونے کے ساتھ ہر طرح سے کامل بھی ہے اور مسلمانوں کی اجتماعیت کی ضامن بھی، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ [3]

آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔

سید ابو الاعلی مودودی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"دین کو مکمل کر لینے سے مراد اس کو ایک مستقل نظامِ فکر و عمل اور ایک ایسا مکمل نظامِ تہذیب و تمدن بنا دینا ہے، جس میں زندگی کے جملہ مسائل کا جواب اصلاً یا تفصیلاً موجود ہو اور ہدایت و راہنمائی حاصل کرنے کے لیے کسی حال میں اس سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئے "[4]

---

(۱) سورۃ اٰل عمران:۱۹

(۲) ﴿وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ جو شخص اسلام کے سوا اور دین تلاش کرے، اس کا دین قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں میں ہو گا۔ (سورۃ اٰل عمران:۸۵)

(۳) سورۃ المائدہ:۳

(۴) مودودی، سید ابو الاعلی، تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۲۰۰۰ء، ۱/ ۴۴۳، ۴۴۴

ایک ایسا صالح اجتماعی نظام جس میں رعایا کو ہر قسم کے حقوق حاصل ہوں، کا دارومدار ان افرادِ کار کے طرزِ عمل پر مبنی ہے، جو اس نظام کو چلاتے ہیں، جس کو اردو زبان میں قیادت کہا جاتا ہے اور عوام کی نمائندگی کرتے ہیں۔ عربی زبان میں اسے عرفاء کہا جاتا ہے جو عریف کی جمع ہے، جن کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا:

« إِنَّ الْعِرَافَةَ حَقٌّ وَلاَ بُدَّ لِلنَّاسِ مِنَ الْعُرَفَاءِ وَلَكِنَّ الْعُرَفَاءَ فِي النَّارِ »[۱]

علاقائی نمائندگی حق ہے اور لوگوں کے لیے نمائندے مقرر کرنا لازم ہے، لیکن برے نمائندے جہنم میں ہوں گے۔

عریف راہنما، سردار اور قائد کے معنی میں آتا ہے[۲] جس کو نقیب بھی کہا جاتا ہے اور اس کی جمع نقباء ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے لیے بارہ نقیب[۳] مقرر کئے تھے، جو اپنے قبیلوں کے نمائندگی اور قیادت کرتے تھے، جو عربی میں قاد یقود سے مصدر کا صیغہ ہے[۴] جس کے معنی سیادت اور تدبیر کے ہیں، معجم الرائد میں ہے:

"**قاد يقود: قيادة (قود) الجيش: كان رئيسا عليه يدبر خططه وشؤونه**"[۵]

کسی لشکر کی قیادت، اس کی منصوبہ سازی اور معاملات کی تدبیر کرنا ہے۔

ریاستی ادارہ کی نظم وضبط کنٹرول کرنا ایک تنظیم کا متقاضی ہے، جس کے لیے عربی میں **ادارۃ** اور انگریزی میں administration کا لفظ مستعمل ہے، جس کے عمل میں دوام اور تسلسل کا پایا جانا ضروری ہے، حسن بن محمد لکھتے ہیں:

" **هي عمل متواصل يبدأ بتحديد الهدف وينتهي بتحقيقه. وهي ليست فرداً وإنما هي علاقة مصمم ومنفذين ومنظم ومتعاونين وموجه ومتجاوبين ومرشد ومطيعين**"[۶]

یہ ایک مسلسل عمل ہے، جو ہدف کے تعین سے شروع ہو کر مقصد کے حصول پر ختم ہوتا ہے۔ یہ انفرادی نہیں بلکہ یہ ایک ادارہ کے نافذ کرنے والا قابلِ توجہ، لائق تعاون ایک منظم کام اور مرشد ومطیع کے درمیان مضبوط تعلق کا نام ہے۔

---

(۱) ابو داود، سلیمان بن اشعث، سنن، باب فی العرافۃ، حدیث نمبر: ۲۹۳۴، دار الکتاب العربی، بیروت، ۳/ ۹۲ شیخ البانی نے اس حدیث کو (عن رجل عن أبيه عن جده) ایک نامعلوم راوی کی وجہ سے ضعیف قرار دیا ہے (شرح سنن ابی داود، عبد المحسن العباد، ۱/ ۲)

(۲) فیروز اللغات، فیروز سنز، لاہور، راولپنڈی، کراچی، ص: ۵۱۹

(۳) سورۃ المائدہ: ۱۲

(۴) حریری، قاسم بن علی، درۃ الغواص فی اوہام الخواص، تحقیق: عرفات مطرجی، مؤسسۃ الکتب الثقافیۃ، ۱۹۹۸ء، ۱/ ۲۶۷

(۵) جبران مسعود، معجم الرائد، ۱/ ۱۶۸

(۶) شریف، حسن بن محمد، ادارۃ عمر الفاروق، ادارۃ المطبوعات، المکۃ المکرمۃ، ۱۴۰۱ھ، ص: ۴۹

اس عبارت میں مرشد اور مطیع کے تعلق سے نہ صرف قانون اور ضابطے کا تصور نکلتا ہے بلکہ اس سے ایک قانون، اصول اور معروف طریقہ کار بھی ملتا ہے، جو ریاست کے نظم وضبط کے لیے ضروری ہے، جیسا کہ کہتے ہیں:

"نظم الأمر: رتبه وجعله خاضعا لقانون أو قاعدة" (۱)

اس نے کام کو منظم کیا اور قانون و قاعدے کا پابند بنایا۔

نظم وضبط کے تصور کو اجاگر کرنے کے لیے قرآن مجید میں نظام، ملک، خلیفہ، شرعۃ اور ائمہ وغیرہ کے الفاظ ملتے ہیں، جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلامی ریاست ایک ادارہ ہے، جس کا ایک عقیدہ، نصب العین، پروگرام، کچھ راہنما اصول اور اخلاقیات کا ایک جامع نظام ہے۔ جس میں حاکم اور رعایا کا باہم ایک سوچ اور فکر و عمل کے تحت متحد ہونا اور انتظامی سرپرستی اور نگہداشت کے لیے آپس میں تعاون کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومت کے تمام اداروں اور افراد کا اولی الامر کے ساتھ باہم مربوط و متعاون ہونا، اس کی کامیابی کے لیے از بس ضروری ہے، لیکن ان سب کا دارومدار قیادت کے فعالیت پر مبنی ہے تاکہ قوم کو مشکل اور آڑے وقت میں گرداب سے نکالا جاسکے۔ ارشد احمد بیگ کہتے ہیں:

> "قیادت کا اصل مفہوم ایسی صلاحیت ہے، جس سے دوسروں پر اثرانداز ہوا جاسکے اور جس سے افرادِ کار میں تحریک، فعالیت اور جزبہ عمل پیدا کیا جائے اور اس کے نتیجے میں مطلوبہ معیار کے مطابق طے اہداف کا حصول ممکن ہو سکے" (۲)

مقالہ ہٰذا میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں وہ راہنما خطوطِ کار فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ایک قائد کے لیے اپنی ذمہ داریوں سے بطریقِ احسن عہدہ براں ہونے کے لیے مدِّ نظر رکھنا ضروری ہے، تاکہ ملک وملت کو صحیح خطوط پر گامزن کیا جاسکے۔

اصول نمبر ۱: نصب العین کی پاسداری

اسلامی ریاست کا واضح نصب العین عقیدہ توحید ہے، جو اپنے تین بنیادی اجزاء: توحید فی الذات، توحید فی الصفات اور توحید فی الالوہیت کے لحاظ سے ازلی وابدی ہے۔ جس طرح وہ اپنی ذات اور صفات میں یکتا اور لامثال ہے، اسی طرح اپنی الوہیت اور معبودیت میں بھی یکتا ہے۔ وہ حاکم اور ہم اس کے بندے اور غلام ہیں۔ اس کے احکام کی غیر مشروط اطاعت کرنا عبادت ہے (۳)۔ اس عقیدے کے لحاظ سے قیادت کے لیے لازم ہے کہ وہ اسلام کے تمام احکامات کا نہ صرف پابند ہو بلکہ اس کی ترویج کے لیے ہمہ جہت اپنے منصب کو بروئے کار لاکر زمین پر اپنے خلیفہ اور

---

(۱) معجم الرائد، ۱/ ۱۴۴۳

(۲) ارشد احمد بیگ، ماہنامہ ترجمان القرآن، لاہور، نومبر ۲۰۱۴ء، ص: ۵۳

(۳) مولانا گوہر رحمان، علوم القرآن، مکتبہ تفہیم القرآن، مردان، ۲۰۰۳ء، ۲/ ۳۴

نائب[1] ہونے کے تقاضے پورا کرے۔ حاکمیت الٰہی کے قیام کو اپنا نصب العین بنا کر اس کے لیے سر توڑ جدوجہد کرے۔ یہ ایک اصولی ریاست قرار پائے گی، جس کی بنیاد عقیدہ توحید پر ہے۔ جس کے بارے میں سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"ایسی (اصولی) ریاست کو صرف وہ لوگ چلاسکتے ہیں جو اس کے دستور پر ایمان رکھتے ہوں، جنہوں نے اس کے مقصد کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہو، جو اس کے اصلاحی پروگرام سے نہ صرف پوری طرح متفق ہوں، نہ صرف اس میں کامل عقیدہ رکھتے ہوں بلکہ اس کی اسپرٹ کو اچھی طرح سمجھتے بھی ہوں اور اس کی تفصیلات سے بھی واقف ہوں" [2]

ریاست کے افراد کو متحد رکھنے کے لیے اس عقیدے کے تحت جدوجہد کا فائدہ یہ ہوگا کہ تمام قوم اتحاد کی لڑی میں پروتی چلی جائیگی۔ اس طرح قوم کو منظم کرنے کے لیے زیادہ توانائی نہ صرف کرنا پڑے گی۔ اس طرح ﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا﴾[3] کے تقاضے بھی پورے ہوجائیں گے۔

لیکن یہ اثر اس وقت ظاہر ہوگا جب اسلامی ریاست کی قیادت خود اور رعایا، اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہوں جو مسلمانوں کے لیے قوت کا سرچشمہ اور سرمایہ افتخار ہے۔ اس طرح اس سے خواہشاتِ نفس کا قلع قمع بھی ہوجائے گا۔ نظام کی بہتری کا اصل قائدہ بھی یہی ہے۔ داود علیہ السلام کو اللہ تعالی نے حکم دیا ہے:

"اے داوٗد ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے، لہٰذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور خواہش نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔ جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں، یقیناً ان کے لیے سخت سزا ہے کہ وہ یوم الحساب کو بھول گئے" [4]

دینِ اسلام کی تعلیمات کو مدِ نظر رکھنا اور اس کی تذکیر و تعمیل اللہ کی راہ سے نہ بھٹکنے میں انسانوں کے لیے مد و معاون ہیں۔ اس کے طے شدہ اخلاق پر کاربند رہنے میں اجتماعی فلاح و بہود[5] کا راز مضمر ہے۔

"اسلام خیر خواہی کا دین ہے" یہ جملہ دہراتے دہراتے ہم مسلمان تھکتے نہیں لیکن خود قیادت کو اس کا عملی نمونہ بننا کس قدر اہم ہے؟ اس کا اندازہ اس آیت سے لگایا جائے، جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے یہود کو تنبیہ فرمائی تھی:

---

(۱) إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً (سورۃالبقرہ:۳۰)

(۲) مودودی، سید ابوالاعلیٰ، اسلامی ریاست، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص:۱۴۸

(۳) سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ میں نہ پڑو (سورۃ ال عمران:۱۰۳)

(۴) سورۃ ص:۲۶

(۵) سورۃ اٰل عمران:۱۳۹

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ اَفَلَاتَعْقِلُوْنَ﴾(۱)

کیاتم دوسروں کو نیکی کا حکم کرتے ہو، مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو کیاتم عقل سے بالکل کام نہیں لیتے؟

اس معمہ کے حل کا تقاضا ہے کہ قیادت اسلام کی تعلیمات کا عملی نمونہ بن جائے تو سوسائٹی سے اس کے نفاذ کا مطالبہ آسان ہو جاتا ہے۔ قول و فعل کے تضاد سے بچنے کے لیے اللہ تعالی نے حضرت شعیب علیہ السلام کے طرزِ عمل کا حوالہ دے کر فرمایا کہ میں اس چیز کی طرف کیسے جھک سکتا ہوں جس سے تم کو روک رہا ہوں(۲) اور قرآن مجید میں ہم کو اس تضاد سے بچنے کا حکم ہے:

﴿لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ﴾ (۳) اے ایمان والو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔

خود رسول اللہ ﷺ آپ ﷺ کے بعد خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس طرزِ عمل کا ثبوت دیا، جو ایک قائد کے لیے نمونہ عمل ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ کو جب خلیفہ بنایا گیا تو فرمانے لگے:

"تم میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کروں، لیکن اگر مجھ سے کوئی ایسا کام سرزد ہو، جس سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کا پہلو نکلتا ہو تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں "(۴)

دنیا کی تاریخ میں رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے خلفائے راشدین سے بہتر حکمرانی کسی نے نہیں کی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے خلفاء احکامات الٰہی کے سب سے زیادہ پاسدار تھے، اور یہی رعایا کی خیر خواہی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«الدِّينُ النَّصِيحَةُ (قال ثلاثاً) قَالُوا: لِمَنْ؟ قَالَ:« لِلَّهِ، وَلِكِتَابِهِ، وَلِرَسُولِهِ، وَلِأَئِمَّةِ الْمُؤْمِنِينَ وَعَامَّتِهِمْ »(۵)

دین میں خیر خواہی ہے، یہ بات آپ ﷺ نے تین بار دہرائی صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا کس کے لئے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے لیے اس کتاب، اس کے رسول، مسلمانوں کے قیادت اور عام رعایا کے لیے یہ خیر خواہی ہے۔

جب اسلامی قیادت نے دین کے احکامات کو حرزِ جان بنایا تو رعایا نے بھی اس کو اپنانے میں دیر نہیں کی اور

---

(۱) سورۃ البقرہ:۴۴

(۲) سورۃ ہود:۸۸

(۳) سورۃ الصف:۳

(۴) ازدی، معمر بن راشد، الجامع، بَابُ لَا طَاعَةَ فِي مَعْصِيَةٍ، تحقیق: حبیب الرحمن اعظمی، المکتب الاسلامی، بیروت، ۱۴۰۳ھ، ۱۱/۳۳۶، ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، خطبہ ابو بکر، ۲/۶۶۱، محمد حسین ہیکل، حضرت سیدنا ابو بکر صدیق، ترجمہ: انجم سلطان شہباز، بک کارنر شوروم، بک سٹریٹ جہلم، ص:۱۰۰

(۵) احمد بن حنبل، مسند، تحقیق: شعیب الأرنؤوط، مؤسسۃ الرسالۃ، طبع اول:۲۰۰۱ء، ۲۸/ ۱۳۸

یوں بہترین حکمرانی ممکن ہوئی۔ لہذا قیادت کے لیے بہترین اصول یہ ہے کہ نظام اسلام کو ممکن العمل بنانے کی کوششیں کرے۔

اصول نمبر ۲ : خدا خوفی

دنیا کے لیے حکمرانی کا بہترین اور قابلِ تقلید نمونہ خلافتِ راشدہ ہے ۔ حکمران اوّل حضرت محمد ﷺ ہیں جو ایک برگزیدہ نبی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک درویش حکمران بھی ہیں۔ وہ کس قدر اللہ سے ڈرنے والے تھے ؟

حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ :

" خولہ بنت حکیم جو عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی پاس پراگندہ حالت میں آئی تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: یہ آپ کی کیا حالت ہے ؟ تو اس نے جواب دیا میرا شوہر قائم اللیل اور صائم النہار آدمی ہے۔ اس کے بعد نبی ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے تو آپ ﷺ کو اس کے بارے میں بتایا۔ پھر آپ ﷺ ابن مظعون رضی اللہ عنہ سے ملے اور فرمایا:

« إِنَّ الرَّهْبَانِيَّةَ لَمْ تُكْتَبْ عَلَيْنَا ، أَفَمَا لَكَ فِيَّ أُسْوَةٌ، فَوَ اللَّهِ إِنِّي أَخْشَاكُمْ لِلَّهِ، وَأَحْفَظُكُمْ لِحُدُودِهِ»[1]

"ابن مظعون ! ہمارے اوپر رہبانیت فرض نہیں ہے۔ کیا آپ کے لیے میری اسوہ کافی نہیں ہے ؟ قسم بخدا میں تم سب سے زیادہ اللہ تعالی سے ڈرتا ہوں اور اللہ کے حدود کا زیادہ محافظ ہوں "

رسول اللہ ﷺ کے بعد خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ریاست کی ذمہ داری سنبھالی اور قیادت وحکمرانی کی اس طرز کو اپنایا، جو رسول اللہ ﷺ نے اختیار کیا تھا۔ خدا خوفی کی یہ حالت تھی کہ ریاست کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ گھریلو مصارف اٹھانے کے لیے اپنے تجارتی پیشے کو بھی چلاتے رہے تاکہ ریاست پر اضافی بوجھ نہ پڑے، جو ان کے پاس مسلمانوں کی امانت تھی، لیکن دیگر صحابہ کرام کے اصرار پر اس کام کو ترک کیا اور ہمہ جہت ریاستی امور کو توجہ دی اور حد سے بڑھ کر رعایا کی خدمت سرانجام دی۔

اس کے بعد خلیفہ دوم کا زمانہ آیا، جن کی خلافت دنیا کے لیے مثالی نمونہ ہے۔ دنیا کے اکثر ممالک نے اس ماڈل کے بیشتر پروگرام اور نظام کو اپنایا بھی ہے۔ اسلام کے احکامات پر عمل اور مخلوق کی خدمت میں آپ رضی اللہ عنہ کی خدا خوفی کی حالت یہ تھی کہ راتوں کو رعایا کی خیر گیری کے لیے گشت فرمایا کرتے تھے۔ فرماتے کہ اگر دجلہ کے دور دراز علاقے میں بھی کسی خچر کو راہ چلتے ٹھوکر لگ گئی تو مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں اللہ تعالی مجھ سے یہ سوال نہ کرے، اے عمر رضی اللہ عنہ تو نے وہ راستہ درست کیوں نہیں کیا ؟ اور اگر فرات کے کنارے بھیڑ کا کوئی بچہ گم ہو کر ہلاک ہو جائے تو عمر رضی اللہ عنہ کو خدشہ ہے کہ اللہ اس سے پوچھے گا۔[2]

---

(۱) صنعانی، عبد الرزاق بن ھمام، مُصَنَّفُ، تحقق: حبیب الرحمن اعظمی، المکتب الاسلامی، بیروت، طبع دوم، ۷/ ۸۷

(۲) خَلَّال، ابو بکر احمد بن محمد، السنۃ، تحقیق: دعطیہ الزہرانی، دار الرایۃ، ریاض، طبع اول: ۱۹۸۹ء، ۲/ ۳۱۷

خلیفہ ثالث عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے خداخوفی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا کہ آپ رضی اللہ عنہ نے شہادت کو قبول کیا لیکن کسی پر اس خوف سے تلوار نہیں اٹھائی کہ ایسے لوگوں کو میں کیونکر قتل کر سکتا ہوں جنہوں نے مجھے قتل نہیں کیا ہے کہ ایسا کرنا ان کو بے گناہی میں قتل کرنے کے مترادف ہیں۔ رعایا پر حد درجہ مہربان اور ان کے خیر گیر تھے۔ عزیز واقارب پر جیب سے خرچ کرنے والے تھے۔

اسی طرح خلیفہ رابع حضرت علی رضی اللہ عنہ اتنے خداخوف تھے کہ انہوں نے خوارج جیسے شدت پسندوں سے مذاکرات کو تلوار پر ترجیح دی۔

علاوہ ازیں اسلامی ریاست کے گورنر جہاں جہاں مقرر تھے، اس فکر کے ساتھ رعایا کی خدمت میں مصروفِ عمل رہتے تھے کہ کہیں مخلوق کی خدمت میں کوتاہی کے مرتکب نہ ٹھہریں، جس کی پاسداری کا عہد وہ ریاست کے ساتھ کر چکے ہیں۔ اس خداخوفی کا نتیجہ تھا کہ رعایا مطمئن اور اللہ تعالیٰ کی مدد بھی شاملِ حال رہتی، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ﴾(۱)

جو شخص اللہ سے ڈرتا ہو وہ اس کے لیے مشکل سے نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے۔ اور اسے ایسے راستے سے رزق دے گا، جدھر اس کا گمان بھی نہ جاتا ہو۔ جو اللہ پر بھروسہ کرے اس کے لئے وہ کافی ہے۔

اصول نمبر۳: اصول پسندی

قیادت کی اصول پسندی ریاستی نظم وضبط، استحکام اور قیادت و رعایا کے مابین بہتر تعلقات کے لیے کے لیے ناگزیر ہے۔ اصول پسندی عقیدہ توحید کا لازمی نتیجہ ہے کہ جس نے ہمیں اصولوں کا پابند بنایا ہے۔ اصول کی پاسداری سے ریاست میں رعایا کے اندر ہم آہنگی وہم رکابی پیدا ہوتی ہے اور امن وسلامتی میں استحکام بھی رہتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ﴾(۲)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں۔

اللہ اور رسول کی اطاعت کے نتیجے میں اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر قیادت خود پابندِ قانون

---

(۱) سورۃ الطلاق:۲-۳

(۲) سورۃ النساء:۵۹

ہے تو آمر و مامور کا تعلق بہتر ہو گا اور فرمان برداری کا جذبہ Grass root level تک کار فرما رہے گا، لیکن یہ سب کچھ جذبہ اطاعتِ الٰہی اور اطاعتِ رسول اللہ ﷺ میں مضمر ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ عَلَى المَرْءِ المُسْلِمِ فِيمَا أَحَبَّ وَكَرِهَ، مَا لَمْ يُؤْمَرْ بِمَعْصِيَةٍ»[1]

ایک مسلمان پر سمع وطاعت لازم ہے خواہ برضا ورغبت ہو یا بکراہت، تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے، پھر جب اس کو معصیت کا حکم دیا جائے تو نہ سمع ہے نہ طاعت۔

ایک ایسی ریاست جہاں اللہ کے دین کا دور دورہ ہو، تو ریاست میں آمر اور مامور سب گویا اللہ تعالیٰ کے دین کے مددگار ہوتے ہیں، جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

﴿قَالَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ ﴾[2]

کون ہے اللہ کی راہ میں میرا مددگار؟ حواریوں نے جواب دیا ہم اللہ کے مددگار ہیں۔

یہ مدد اس معنی میں نہیں کہ گویا یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی کوئی ضرورت پوری کرتے ہیں، جس کے لیے وہ ان کی مدد کا محتاج ہے، بلکہ یہ اتنا عظیم کام ہے جس میں یہ لوگ حصہ لیتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ اپنی قوتِ قاہرہ کے ذریعے سے کرنے کے بجائے اپنے انبیاء علیہم السلام اور کتابوں کے ذریعہ سے کرنا چاہتا ہے[3] گویا مخلص قیادت اللہ تعالیٰ کے دین کے معین و مددگار ہوتی ہیں۔ ایسی ہی قیادت اجتماعیت اور نظم وضبط کو برقرار رکھ کر ریاست کو شاہراہِ ترقی پر گامزن کر سکتی ہے۔ ایک طرف ان پر اللہ کے رحمت کا سایہ[4] ہو گا اور دوسری طرف پوری قوم اس کے ساتھ دیتی ہے، جہاں امارت کا کوئی جھگڑا نہیں ہو گا۔ آپ ﷺ نے اس ضمن میں فرمایا ہے:

« أَنْ لَا نُنَازِعَ الْأَمْرَ أَهْلَهُ »[5]

اہل قیادت سے امارت واپس نہیں لیا جائے گا۔

کیونکہ لالچی ،اصول پامال اورنا اہل قیادت بہادری اور قربانی کے جذبوں سے سرشار قوم کو تباہی کے دھانے پر لا کھڑا کرتی ہے اور انتشار پیدا ہوتا ہے۔ لہذا اہداف کا تعین، اصولوں کی پابندی اور مخلص قیادت آج مسلم ریاستوں کی اہم ضرورت اور عصرِ حاضر کا تقاضا ہے۔

---

(۱) بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، باب السمع والطاعۃ للامام، حدیث نمبر:۷۱۴۴، ترقیم: محمد فؤاد عبد الباقی، دار الشعب، قاہرہ، طبع اول

(۲) سورۃ آل عمران:۵۲

(۳) تفہیم القرآن، ۵/ ۴۸۰

(۴) حمید بن مخلد ابن زنجویہ، الاموال، حدیث نمبر:۸۱۵، تحقیق :الدکتور شاکر ذیب فیاض، مرکز الملک فیصل للبحوث والدراسات الاسلامیۃ، السعودیۃ، ۱۹۸۶ء

(۵) صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، حدیث نمبر:۷۰۵۶

اصول نمبر۴: خود غرضی سے اجتناب

اسلامی تعلیمات میں بطورِ خاص قیادت کو خود غرضی سے اجتناب برتنے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ اس روش سے وہ ساری کاوشیں بے اثر ہو کر رہ جاتی ہیں، جو ریاست اور رعایا کی بہتری کے لیے بروئے کار لائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے قیادت کے لیے تحائف کا لینا ممنوع قرار دیا ہے، جو بالآخر لالچ اور رشوت کا دروازہ کھول دیتے ہیں، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا:

"کیا حال ہے اس عامل کا جس کو میں مقرر کرتا ہوں پھر وہ کہتا ہے یہ تمہارا مال ہے اور یہ مجھے ہدیہ ملا۔ وہ اپنے باپ یا ماں کے گھر میں کیوں نہ بیٹھا رہا پھر دیکھتے کہ اس کو ہدیہ ملتا یا نہیں"۔

«وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ، لَا يَأْتِي أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنْهَا بِشَيْءٍ إِلَّا جَاءَ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَى رَقَبَتِهِ، إِنْ كَانَ بَعِيرًا لَهُ رُغَاءٌ، أَوْ بَقَرَةً لَهَا خُوَارٌ، أَوْ شَاةً تَيْعَرُ ثُمَّ رَفَعَ يَدَيْهِ حَتَّى رَأَيْنَا عُفْرَةَ يَدَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: «اللَّهُمَّ هَلْ بَلَّغْتُ»»[1]

قسم بخدا کوئی تم سے ایسا مال نہ لے گا مگر قیامت کے دن اپنے گردن پر لاد کر اس کو لائے گا۔ اونٹ ہو گا تو وہ بڑبڑاتا ہو گا۔ گائے ہو گی تو وہ چلاتی ہو گی۔ بکری ہو گی تو وہ میں میں کرتی ہو گی، پھر آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے یہاں تک کہ بغلوں کی سفیدی ہم کو نظر آئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: یا اللہ میں نے تیرا حکم پہنچا دیا۔

اس حدیث کی شرح میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"اس حدیث سے واضح ہے کہ عمال حکومت اور دیگر آفسرانِ حکومت اور اہم شخصیات کے لیے ہدایا قبول کرنا جائز نہیں۔ حقیقتاً یہ ہدیہ کی صورت میں رشوت ہے۔ اور ہدیے عمال پر اس لیے حرام ہیں کہ حکومت کے حقوق، امت کے اموال اور افراد کے حقوق کو ان کے فضول خرچیوں سے بچایا جائے۔ تاکہ وہ اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے کسی کا حق دوسرے کو نہ دیں۔ اور یوں ہدیے والے کو خصیم کا مال حوالہ نہ کریں"

"ولولا طمع المهديين في الظفر بحق خصومهم أو بحق من حقوق الدولة ما بذلوا تلك الهدايا ولهذا حرمت الرشا والهدايا على أصحاب الحكم والنفوذ"[2]

اگر ہدایا دینے والے کو اپنے مدِ مقابل کے حق، یا حکومت کے حق میں سے کچھ حقوق کے حصول کا طمع اور لالچ نہ ہوتی تو وہ یہ ہدیے نہ دیتا۔ اس وجہ سے اولی الامر اور باثر حضرات کے لیے رشوت اور ہدیے حرام کر دیے گئے ہیں۔

---

(۱) مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۳۵۹۸، ۷/ ۳۹

(۲) شافعی، امام محمد بن ادریس، مسند، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۵۱ء، ۱/ ۲۴۶

لہذا اسلامی ریاست کی قیادت حدیث کے مطابق راعی ہیں، جو رعایا کو ان کے حقوق کے تحفظ کے ساتھ بیرونی و اندرونی دشمنوں سے حفاظت فراہم کرتے ہیں۔ حدیث سے بصراحت ثابت ہے کہ مسلمان عوام کے حقوق کا تحفظ اسلامی ریاست کی مخلص قیادت کے بغیر ممکن نہیں ہے، (۱) جو رعایا کے لیے اللہ کے رحمت کا سایہ اور ڈھال ہے (۲) لیکن اگر وہ خود غرض اور لالچی بن جائے تو ریاست اور رعایا کا وجود اور تحفظ خطرے میں پڑ جاتا ہے اور بیرونی دشمنوں کے ریشہ دوانیوں سے تحفظ فراہم نہیں کیا جا سکتا، جیسا کہ آج اکثر اسلامی ریاستوں کی حالت ہے۔ اس لالچ اور خود غرضی کا دروازہ بند کرتے ہوئے آپ ﷺ نے عبد الرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

«لاَ تَسْأَلِ الإِمَارَةَ، فَإِنَّكَ إِنْ أُوتِيتَهَا عَنْ مَسْأَلَةٍ وُكِلْتَ إِلَيْهَا، وَإِنْ أُوتِيتَهَامِنْ غَيْرِ مَسْأَلَةٍ أُعِنْتَ عَلَيْهَ» (۳)

امارت کو طلب نہ کرو۔ اگر درخواست پر تجھے سرداری مل گئی، تو اسی کے حوالے کر دیے جاؤ گے۔ اور اگر وہ بن مانگے دی گئی تو اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے (اللہ کی طرف سے) تیری مدد کی جائے گی۔

چنانچہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"جو شخص سیاسی قائد ہو اور اپنی ذاتی اغراض اور مفاد کے لیے حکومت کرتا ہو تو اس کے نتیجے میں خرابی پیدا ہو گی اور آخر کار یہ حکمران خود بھی تباہ ہو جائے گا، لیکن جو حکمران اور سیاسی لیڈر شریعت حقہ کا پابند ہو تو مصالح اور بھلائیاں پھیلیں گی اور ریاست کا نظام احسن طریقے سے چلتا رہے گا "(۴)

لہذا خود غرض لوگوں کو قیادت سے دور رکھنا چاہئے تاکہ ریاست کی ناکامی پر ندامت کے آنسو بہانے اور پچھتاوے سے بچ جائیں، جس کی طرف نبی کریم ﷺ نے ان الفاظ میں راہنمائی فرمائی ہے:

«إِنَّكُمْ سَتَحْرِصُونَ عَلَى الإِمَارَةِ، وَسَتَكونُ نَدَامَةً يَوْمَ القِيَامَةِ »(۵)

عنقریب تم میں امارت کی حرص پیدا ہو گی، لیکن وہ قیامت کے دن ندامت کا باعث ہو گی۔

عبد الغفار حسن رحمۃ اللہ علیہ تشریح میں لکھتے ہیں:

" انسان منصب کے عہدے پر براجماں ہو کر خوب مزے لوٹتا ہے، لیکن جب موت یا معزولی کی وجہ سے یہ منصب چھینا جاتا ہے تو پھر ان لذتوں اور مسرتوں کی یاد حسرت و اندوہ کی شکل میں اس کو ستاتی ہے "(۶)

---

(۱) مولانا گوہر رحمان، اسلامی سیاست، ادارہ تفہیم القرآن مردان، ۱۹۹۱ء، ص: ۱۲۴
(۲) الاموال، بَابٌ: فِي وُجُوبِ السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ عَلَى الرَّعِيَّةِ وَمَا فِي مُنَازَعَتِهِمْ، وَالطَّعْنِ عَلَيْهِمْ، حدیث نمبر: ۳۲، ۱/ ۷۷
(۳) صحیح بخاری، كِتَابُ الأَيْمَانِ وَالنُّذُورِ، حدیث نمبر: ۶۶۲۲
(۴) رازی، محمد بن عمر، التفسیر الکبیر، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۲۶/ ۱۹۹
(۵) البانی، محمد ناصر الدین، مُخْتَصَر صَحِيحُ بُخَارِي، باب مایکرہ من الحرص علی الامارۃ، مکتبہ معارف، ریاض، ۲۰۰۲ء، ۴/ ۲۸۵
(۶) عمر پوری، عبد الغفار حسن، انتخابِ حدیث، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص: ۳۰۷

اصول نمبر۵ : عدل ومساوات کی پاسداری

نظم وضبط کو برقرار رکھنا ہو یا معاشرہ میں استقرار واستحکام، ان سب کا عدل وانصاف اور مساوات سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ جہاں عدل وانصاف اور مساوات پر توجہ دی جاتی ہے ،تو معاشرے میں نظم وضبط قائم رہنے میں آسانی رہتی ہے، جو حکومت کے لیے سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اس لیے اسلام میں "عدل واحسان" (۱) پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اس کو معاشرے کا ایک اہم ستون اوراخلاقی وصف قرار دیا ہے۔ جس سے معاشرہ امن وسلامتی کا گہوارہ بنتا ہے۔ اس کے لیے اہل ایمان کو عدل وانصاف سے کام لینے کا حکم ہے، خواہ جانی دشمن سے معاملہ کیوں نہ ہو، ارشاد باری تعالیٰ ہے :

> " اے ایمان والو ! اللہ کے لیے انصاف کی گواہی دینے کے لیے کھڑے ہو جایا کرو اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ عدل چھوڑ دو۔ عدل کیا کرو کہ یہ تقویٰ کی بات ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو " (۲)

لہذا قیادت اس سلسلے میں بالکل کوتاہی نہ کرے تاکہ امن و سلامتی کو برقرار رکھا جاسکے۔ یہ اس قدر ضروری امر ہے کہ اسلام میں باپ کا بدلہ بیٹے سے لینے کی بھی گنجائش نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا:

«اَلَا لَایُجْنیٰ وَالِد عَلیٰ وَلَدِہ» (۳) خبردار باپ کا بدلہ بیٹے سے نہ لیا جائے۔

عدل وانصاف اور مساوات معاشرے کی اجتماعی ضرورت ہیں۔ جو اس عظیم خدمت کو سرانجام دیتا ہے، نبی کریم ﷺ نے اسے عظیم الشان خوشخبری سنائی ہے:

«اِنَّ الْمُقْسِطِیْنَ عَلیٰ مَنَابِرَ مِنْ نُّوْرٍ عَلیٰ یَمِیْنَیْنِ الرَّحْمٰنُ الَّذِیْنَ یَعْدِلُوْنَ فِي حُکْمِھِمْ» (۴)

عدل وانصاف کرنے والے لوگ اللہ کے نزدیک دائیں جانب نور کے مسندوں پر بیٹھے ہونگے (کیونکہ) وہ فیصلوں میں انصاف سے کام لیا کرتے تھے۔

قیادت کے دائرہ کار کو بیان کرتے ہوئے امام ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں :

> "امام عادل سے مراد وہ ذمہ دارانِ حکومت اور سربراہان ریاست ہیں جن کو مسلمانوں کے مصالح اور بہبود کے کام سپرد کئے گئے ہوں۔ امام عادل کا جو رتبہ ہے اس آدمی کو بھی ملے گا جو مسلمانوں کے کسی کام کا ذمہ دار بنایا گیا ہو اور عدل وانصاف کے ساتھ کام کرتا ہو"(۵)

---

(۱) سورۃ النحل: ۹۰
(۲) سورۃ المائدہ:۸
(۳) دار قطنی، علی بن عمر، السنن، کتاب البیوع، مکتبہ قدوسیہ، لاہور، ۳/ ۴۵
(۴) نسائی، احمد بن شعیب، سنن، حدیث نمبر:۵۳۸۱، دار السلام، ریاض، ۱۹۹۹ء
(۵) ابن حجر عسقلانی، احمد بن علی، فتح الباری شرح صحیح البخاری، دار المعرفہ، بیروت، ۱۳۷۹ھ، ۲/ ۱۴۴

انصاف کرنے والوں سے اللہ تعالی نے اپنی محبت کا اظہار اس لیے فرمایا ہے کہ ان کی اس عمل سے نہ صرف مخلوق خدا کے حقوق کی پاسداری ہوتی ہے بلکہ نظم وضبط کا قیام بھی عمل میں آتا ہے۔ لہذا ایسی ریاست کا قیام اسلام کی نظر میں ایک جہادِ عظیم ہے۔ اس کی خاطر تمام اداروں کو اپنی قابلیتیں، صبر ازما کوششیں اور غور و فکر کی تمام صلاحیتیں بروئے کار لانی چاہئے تاکہ انسانوں کو ان کے حقوق دلائے جاسکے۔ عدل وانصاف اور مساوات اس قدر اہم معاشرتی عمل ہے کہ اس کی تاکید بائبل میں بھی آئی ہے:

> "خداوند تمہارے خدا کے تمہیں دیے ہوئے ہر شہر میں اپنے ہر قبیلے کے لیے قاضی اور حاکم مقرر کرلو جو سچائی سے لوگوں کا انصاف کریں۔ تم انصاف کا خون نہ کرنا اور غیر جانبدار رہنا، تم رشوت نہ لینا کیونکہ رشوت دانشمند کی آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے اور راست بازوں کی باتوں کو توڑ مروڑ ڈالتی ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ انصاف پر قائم رہنا تاکہ تم جیتے رہو" (۱)

ایک دوسری جگہ ذکر ہے:

> "تم خدا کا کلام سنو! خداوند فرماتا ہے کہ انصاف اور راست بازی کے کام کرو، مظلوم کو اس پر ظلم کرنے والے کے ہاتھ سے چھڑاو، بیگانہ، یتیم اور بیوہ کے ساتھ برا سلوک نہ کرو" (۲)

رہبر انسانیت محمدِ مصطفیٰ ﷺ نے اس وقت مساوات کا درس دیا، جس وقت انسانیت لفظ مساوات سے ناآشنا ہو چکی تھی، چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا:

> "سوائے تقویٰ کے کسی عربی کو عجمی پر اور کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں" (۳)

اسلام نے مصنوعی امتیازات کو مٹایا اور فطری و عملی مساوات کو نافذ کیا اور اس کا حصول بھی ممکن بنایا۔ ایسے نہیں جن کے لیے انسانوں کی آزادی سلب کرلی جائے۔ اس لیے تمام الہامی مذاہب میں اس کے قیام پر زور دیا گیا ہے۔

انسانی تاریخ میں پہلی مرتبہ عدل ومساوات کی عملی صورت اس وقت ظاہر ہوئی، جس وقت آقائے دوجہاں ﷺ نے امیر و فقیر، غلام و آقا کے درمیان سارے امتیازات کو مٹایا۔ جس کی ترجمانی اقبال نے ان الفاظ میں کی ہے:

---

(۱) استثناء ۱۶: ۱۸-۲۰، بائبل، پاکستان بائبل سوسائٹی، انارکلی لاہور، ۲۰۰۷ء
(۲) یسعیاہ؛ ۲۲: ۲-۳
(۳) مسند احمد، ۵/ ۱۴۴

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود وایاز نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز
بندہ وصاحب ومحتاج وغنی ایک ہوئے تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے(۱)

اسلام نے اس قدر مساوات کا اہتمام کیا کہ غلاموں کا درجہ بلند کرکے ان کے حقوق کو ریاست کے ہر فرد بشمول خلیفہ کے برابر کر دیا۔ اس قانونی مساوات کی تاکید آقائے دوجہاں ﷺ نے ان الفاظ میں فرمائی ہے:

«مَنْ قَتَلَ عَبْدَهُ قَتَلْنَاهُ وَمَنْ جَدَعَ عَبْدَهُ جَدَعْنَاهُ وَمَنْ اَخْصیٰ عَبْدَهُ اَخْصَيْنَاهُ»(۲)

جو اپنے غلام کو قتل کرے گا اسے ہم قتل کریں گے، جو اس کی ناک تراشے گا اس کی ناک تراش لی جائی گی اور جو اس کو خصی کرے گا، ہم اسے خصی کریں گے۔

اسلامی شریعت کی نظر میں تمام لوگ برابر اور مساوی ہیں اور سب کے ساتھ برابری کے سلوک کا حکم ہے، کیونکہ اس کو نظر انداز کرنے سے ظلم کی راہیں کھلتی ہیں، جو اسلام بند کرنا چاہتا ہے۔ خود نبی کریم ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہمیں یہی بتاتا اور سکھاتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم سے پہلے امتیں اس لیے تباہ ہوئیں کہ وہ کم تر درجہ کے مجرموں کو قانون کے مطابق سزا دیتے تھے اور برتر کو چھوڑ دیتے تھے۔

« وَ الَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِه لَوْ اَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتُ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا»(۳)

خدا کی قسم !اگر فاطمہ (بنت محمد ﷺ) بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹتا۔

اصول نمبر ۶ : گروہی، قومی، اور قبائلی عصبیت سے اجتناب

ریاستی قیادت کو عصبیت کی تمام اقسام سے پاک ہونا ضروری ہے، البتہ اسلامی و قومی غیرت و حمیت کوٹ کوٹ کر بھری ہو کیونکہ اسلام وحدت واخوت کو فروغ دیتا ہے اور تفریق کے ایسے سلوگن اور نعرے جس سے عصبیت اور رنگ و نسل کی بدبو آتی ہو، کی نفی کرتا ہے۔ اس کو کلمہ خبیثہ اور منتنہ قرار دیتا ہے۔ ایک موقعہ پر انصار و مہاجرین کے درمیان ایسی کیفیت پیدا ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«دَعُوهَا فَإِنَّهَا مُنْتِنَةٌ» وفي رواية «دَعُوهَا فَإِنَّهَا خَبِيثَةٌ»(۴)

یہ بدبودار اور خبیث کلمہ ہے اسے چھوڑو۔

---

(۱) علامہ محمد اقبال، بانگ درا، شکوہ، رابعہ بک ہاوس، کریم مارکیٹ، لاہور، ص:۱۴۹
(۲) ترمذی، محمد بن عیسی، سنن، اَبْوَابُ الدِّيَاتِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي الرَّجُلِ يَقْتُلُ عَبْدَهُ، حدیث نمبر:۱۴۱۴، تحقیق: احمد محمد شاکر، شرکہ مکتبہ ومطبعہ مصطفی البابی الحلبی، مصر، طبع دوم: ۱۹۷۵ء، ۴/۲۶
(۳) صحیح مسلم، بَاب قَطْعِ السَّارِقِ الشَّرِيفِ وَغَيْرِهِ وَالنَّهْيِ عَنِ الشَّفَاعَةِ فِي الْحُدُودِ، حدیث نمبر:۳۱۶۹، دار الجیل، بیروت
(۴) صحیح بخاری، بَابُ مَا يُنْهَى مِنْ دَعْوَةِ الجَاهِلِيَّةِ، حدیث نمبر:۴۹۰۵

اسلامی ریاست اجتماعیت کا مظہر اوراس کی قیادت وحدت کی علامت ہے۔ان کے لئے عصبیت اور رنگ و نسل کے تفریق کے بتوں کو کسی قیمت پر اپنے معاشرے میں پنپنے نہیں دینا چاہئے۔اقبال نے خوب کہا ہے:

تمیز رنگ و بو برما حرام است　　　　که ما پرورده یک نو بهاریم (۱)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

بتانِ رنگ وخوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا　　　　نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی (۲)

بلکہ اسلامی ریاست کی قیادت کی ذمہ داری ہے کہ تعصب کے ان بتوں کو پاش پاش کریں اور اسلامی اخوت کو فروغ دیں۔مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔اللہ تعالی کا حکم ہے کہ دین اسلام کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے تھام لیں۔(۳)

موجودہ حالات میں اسلامی ریاستیں گروہی، شخصی، قبائلی، مسلکی اور رنگ و نسل کی عصبیت اوران جیسی دیگر سرگرمیوں کی قطعاً متحمل نہیں ہوسکتی۔اس قسم کی سرگرمیاں ریاست کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیتی ہیں اور امن و امان کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔دینِ اسلام خطرے میں پڑ جاتا ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا:

”وہ ہم میں سے نہیں جو عصبیت کی طرف بلائے، عصبیت کے لیے لڑے اور عصبیت کے نظریے پر مرے“ (۴)

اصول نمبر ۷ : امانت و دیانت کا حامل

فریب کاری و بد دیانتی سے اجتناب اس لیے ضروری ہے کہ یہ صفات نہ صرف ایک فرد کی ساکھ کو متاثر کر دیتی ہیں، بلکہ پوری ریاست اور ملت کو بد دیانت اور خائن بنا دیتی ہیں۔خاص کر جب ریاست کا سربراہ اور کلیدی عہدے دار بد دیانت اور خائن ہو۔اسلامی ریاست کے تمام قیادت کو امانت دیانت کی صفات سے مزین ہونا ضروری ہے۔اللہ تعالیٰ نے ریاستی عہدوں اور اہم ذمہ داریاں اہل اور امانت دار افراد کو سپرد کرنے کا حکم دیا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا ﴾(۵)

بے شک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو پہنچا دو۔

عوام الناس میں نظم وضبط کے قیام اور ریاست میں انتظامی استحکام کے لیے ضروری ہے کہ اہلیت کو مد نظر رکھا جائے اور امین افرادِ کار کو اہم ذمہ داریاں دی جائیں، تاکہ مفاد عامہ میں بہتری لائی جاسکے۔اقبال نے کہا تھا:

---

(۱) ماہنامہ، ترجمان القرآن، نومبر ۲۰۱۴ء، ص:۷۶

(۲) بانگِ درا، ص:۲۹۰

(۳) سورۃ آل عمران:۱۰۳

(۴) بیہقی، احمد بن الحسین، الآداب، تعلیق: السعید المندوہ، مؤسسۃ الکتب الثقافیۃ، بیروت، طبع اول: ۱۹۸۸ء، ۱/ ۶۹

(۵) سورۃ النساء:۵۸

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا[۱]

امانت و دیانت آج ہماری ریاست کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ نااہلی اور بد دیانتی کی وجہ سے نہ صرف افرادی قوت اور سرمایہ کا ضیاع ہو رہا ہے بلکہ ملک و قوم اجتماعی تباہی سے دوچار ہے۔ قیامت کی رسوائی اس کے علاوہ ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ " ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو نصیحت کرنے کے لیے کھڑے ہوئے اور مالِ غنیمت میں چوری کرنے کو بڑا گناہ قرار دیا، پھر فرمایا: قیامت کے دن میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ آئے اور اس کی گردن پر ایک اونٹ بڑبڑا رہا ہو۔ وہ کہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! میری مدد کیجیے، میں کہوں گا مجھے کوئی اختیار نہیں ہے۔ میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے دن اپنی گردن پر ایک بکری لیے ہوئے ہو، جو میں میں کر رہی ہو اور کہے: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم !میری مدد کیجیے، میں کہوں گا مجھے کچھ اختیار نہیں ہے۔ میں نے تجھے اللہ تعالی کا حکم پہنچا دیا تھا۔ میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے دن آئے اپنی گردن پر کوئی جان لیے ہوے، جو چلاّ رہی ہو، پھر کہے: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم !میری مدد کیجیے۔ میں کہوں گا مجھے کوئی اختیار نہیں ہے، میں نے تجھے اللہ کا حکم پہنچا دیا تھا۔ میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے دن آے اپنی گردن پر کپڑے لیے ہوے، جو اوڑھے ہوں یا چندیاں کاغذ کی جو اڑ رہی ہوں یا اور چیزیں جو ہل رہی ہوں، پھر کہے: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! میری مدد کیجیے

«فَأَقُولُ لَا أَمْلِكُ لَكَ شَيْئًا قَدْ أَبْلَغْتُكَ لَا أُلْفِيَنَّ أَحَدَكُمْ يَجِيءُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَى رَقَبَتِهِ صَامِتٌ فَيَقُولُ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَغِثْنِي فَأَقُولُ لَا أَمْلِكُ لَكَ شَيْئًا قَدْ أَبْلَغْتُكَ» [۲]

میں کہوں مجھے کوئی اختیار نہیں ہے میں تجھے خبر کر چکا تھا۔ میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے دن آئے اپنی گردن پر سونا چاندی وغیرہ لیے ہوئے اور کہے: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! میری مدد کیجیے۔ میں کہوں گا مجھے کوئی اختیار نہیں ہے۔ میں تجھے خبر کر چکا تھا۔

رعایا کا حق ضائع کرنا بد دیانتی ہے اور اس قدر خطرناک معاملہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص کا جنازہ نہیں پڑھتے تھے، جس پر کسی کا قرض ہوتا تھا، چہ جائے کہ کوئی اجتماعی (ریاست اور عوام کے ساتھ) بد دیانتی کا مرتکب ہوا ہو جو اس کے لیے جنت سے محرومی کا سبب بنے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَا مِنْ عَبْدٍ يَسْتَرْعِيهِ اللَّهُ رَعِيَّةً يَمُوتُ يَوْمَ يَمُوتُ، وَهُوَ غَاشٌّ لِرَعِيَّتِهِ إِلَّا حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ» [۳]

جس بندے کو اللہ حکمرانی دے اور وہ اس میں خیانت کر کے جب مرے گا، اللہ تعالی اس پر جنت حرام کرے گا۔

---

(۱) بانگِ درا، ص:۲۹۰

(۲) صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۴۸۳۹، ۳/۱۴۶۱

(۳) طیالسی، سلیمان بن داود، مسند، حدیث نمبر:۹۷۱، تحقیق: د. محمد عبد المحسن ترکی، دار ہجر، مصر، طبع اول:۱۹۹۹ء

قوم و ملک کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے امین و صادق قیادت ہونی چاہئے کیونکہ یہ صفات انسان کو ہر دلعزیز بنا دیتی ہیں، جن پر لوگ اعتبار کرتے ہیں۔ یہی ہمارے نبی ﷺ اور خلفائے راشدین کی زندگی کا اثاثہ تھا۔ جو آخرت میں سرخروئی کا سبب بھی ہے۔ ان صفات کو شعار بنالینا اس قدر اہم ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا يَغُرَّنَّ صَلَاةُ امْرِئٍ، وَلَا صِيَامُهُ، مَنْ شَاءَ صَامَ، وَمَنْ شَاءَ صَلَّى، وَلَكِنْ لَا دِينَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ»(۱)

کسی کی نماز، روزہ سے دھوکہ نہ کھاؤ، جو چاہے روزہ رکھیں، نماز پڑھے، لیکن اس شخص کا دین ہی نہیں جو امانت دار نہیں۔

قیادت امانت و دیانت کی صفات سے متصف ہو تو رعایا سے اس کی وفاداری کی توقع کی جاسکتی ہے۔ بین الاقوامی طور پر اسلامی ریاست کے وقار قائم رکھنے کے لیے بھی مفید ہے۔ امانت کے وسیع تصور کو سامنے رکھتے ہوئے ہر قسم کے وسائل ہمارے پاس امانت ہیں۔ قائد کے پاس انسانی، مالی اور مادی تمام وسائل امانت ہیں۔ اسی طرح اختیارات بھی امانت ہیں۔ چنانچہ قیادت کا اجلا پن اس میں ہے کہ وہ انسانی وسائل کا درست استعمال کرے۔ اپنے پیچھے چلنے والوں کی فکر کرے۔ مالی لحاظ سے سادگی اور میانہ روی کا مظاہرہ کرے۔ مالی معاملات میں شفافیت کو برقرار رکھے اور اسی طرح ذاتی، تنظیمی اور ریاستی حوالے سے مادی وسائل کے استعمال میں فرق ملحوظ رکھے۔ یہ سب اعلیٰ اوصاف اور بہترین قدریں ہیں اور دین میں مطلوب بھی ہیں(۲)

اصول نمبر ۸ : ملنساری اور شگفتہ مزاجی

ملنساری اور شگفتہ مزاجی اسلامی اخلاقیات اور مومن کی صفات میں سے ہیں۔ تاہم یہ صفات ایک قائد میں اس لیے لازمی ہیں کہ رعایا کو اس سے انس اور محبت ہو اور یوں تعاون و تناصر سے پورا معاشرہ بنیانِ مرصوص(۳) بن جائے۔ آپ ﷺ نے مومن کو شگفتہ مزاج اور محبت و الفت کا محور قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«الْمُؤْمِنُ مَأْلَفٌ، وَلَا خَيْرَ فِيمَنْ لَا يَأْلَفُ، وَلَا يُؤْلَفُ»(۴)

مومن محبت و الفت کی جگہ ہے اور اس شخص میں کوئی خیر نہیں جو الفت رکھتا ہے اور نہ اس سے کوئی محبت کرتا ہے۔

نبی کریم نہ صرف ایک رسول تھے بلکہ آپ ﷺ ایک حکمران بھی تھے۔ آپ کس قدر خوش مزاج تھے۔ ایک صحابی عبد اللہ بن حارث رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

---

(۱) جامع معمر بن راشد، حدیث نمبر: ۲۰۱۹۲، ۱۱/ ۱۵۷
(۲) ماہنامہ ترجمان القرآن، ارشد احمد بیگ، نومبر ۲۰۱۴ء، ص: ۵۹
(۳) سورۃ الصف: ۴
(۴) مسند احمد، ۱۵/ ۱۰۶

«مَا رَأَيْتُ أَحَدًا أَكْثَرَ تَبَسُّمًا مِنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ »(۱)

میں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کسی کو تبسم فرمانے والا نہیں دیکھا۔

راست گفتاری، رزق کی پاکیزگی اور خوش خلقی مومن کا عظیم سرمایہ ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ چار چیزیں تمہیں میسر ہوں تو دنیا کی کسی چیز سے محرومی تمہارے لئے نقصان دہ نہیں ہے۔۔۔ ان میں سے ایک خوش خلقی ہے (۲)

خوش خلقی اور خندہ پیشانی معروفات میں سے ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے صدقہ قرار دیا ہے، فرمایا:

« كُلُّ مَعْرُوفٍ صَدَقَةٌ،وَمِنَ الْمَعْرُوفِ أَنْ تَلْقَى أَخَاكَ بِوَجْهٍ طَلْقٍ »(۳)

ہر معروف صدقہ ہے، اور اپنی بھائی سے خندہ پیشانی سے ملنا بھی ایک صدقہ ہے۔

لہذا اسلامی ریاست کے لیڈر شپ کو ایسے صفات سے مزین ہونا چاہیے جو اسے ہر دلعزیز بنادیں۔

اصول نمبر۹ : نرمی برتنا، خیر خواہی چاہنا اور دھوکہ دہی سے پرہیز کرنا

نرم خوئی اور خیر خواہی وہ صفات ہیں جو قیادت اور رعایا دونوں کے مابین اچھے تعلقات استوار کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ آپ ﷺ نے رعایا پر بے جا سختی سے منع کیا اور ان سے سختی برتنے والوں کے لیے جہنم کی وعید اور نرمی کرنے والوں کے لیے دعائے خیر فرمائی ہے:

«اللهُمَّ مَنْ وَلِيَ مِنْ أَمْرِ أُمَّتِي شَيْئًا فَشَقَّ عَلَيْهِمْ، فَاشْقُقْ عَلَيْهِ، وَمَنْ وَلِيَ مِنْ أَمْرِ أُمَّتِي شَيْئًا فَرَفَقَ بِهِمْ، فَارْفُقْ بِهِ»(۴)

اے اللہ جس شخص کو میرے امت کی ذمہ داریوں میں سے کوئی ذمہ داری دے دیں اور وہ ان پر سختی کریں تو بھی ان پر سخت ہو جا اور جو ان داریوں میں سے کوئی ذمہ داری لے لیں اور پھر ان سے نرمی کا معاملہ کرلیں تو بھی ان کے ساتھ نرمی کا معاملہ فرمالیں۔

نرم خوئی سے محرومی کو آپ ﷺ نے خیر سے محرومی قرار دیا ہے :

«مَنْ يُحْرَمِ الرِّفْقَ، يُحْرَمِ الْخَيْرَ»(۵)

جو انسان نرم خوئی سے محروم ہوا وہ خیر سے محروم ہے۔

اسی طرح اسلامی ریاست کی قیادت کو رعایا کے ساتھ خیر خواہی کا جذبہ اور رویہ برتنا بھی خیر کا باعث ہوتا ہے۔ اس جذبہ سے محروم قیادت قیامت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم رہے گی۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

---

(۱) عبد اللہ بن مبارک، الزھد والرقائق، تحقیق: حبیب الرحمن اعظمی، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱/ ۴۷

(۲) عبد اللہ بن وہب، الجامع فی الحدیث، تحقیق: د مصطفی حسن، دار ابن الجوزی، ریاض، ۱۹۹۵ء، ۱/ ۶۴۱

(۳) مسند، احمد، ۱۵/ ۱۰۶

(۴) مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، باب فضیلۃ الامام العادل، تحقیق: محمد فؤاد عبد الباقی، دار احیاء التراث العربی بیروت، ۳/ ۱۴۸۵

(۵) صحیح مسلم، باب فضل الرفق، حدیث نمبر: ۴۶۹۴، ۴/ ۲۰۰۳

"جو حاکم مسلمانوں کی حکومت کا کوئی منصب سنبھال لیں پھر اس کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے جان نہ لڑائے اور خلوص کے ساتھ کام نہ کریں، وہ مسلمانوں کے ساتھ جنت میں قطعاً داخل نہ ہوں گے " (۱)

ایک اور حدیث میں اپنی رعیت کو دھوکہ دینے والوں کے بارے میں آپ ﷺ نے یہ خبر دی ہے:

«مَا مِنْ وَالٍ يَلِي رَعِيَّةً مِنَ الْمُسْلِمِينَ، فَيَمُوتُ وَهُوَ غَاشٌّ لَهُمْ، إِلَّا حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الجَنَّةَ» (۲)

جو مسلمانوں کا سربراہ بنے، اور اس حال میں مرے کہ وہ ان کو دھوکہ دیتا تھا تو اللہ تعالی اس پر جنت حرام کر دیتا ہے۔

کوئی بھی قائد اپنے کام میں سرخرو ہونے کے لیے رعایا کے اعتماد اور تعاون کا محتاج ہوتا ہے۔ ان کا یہ تعاون ان کے ساتھ نرمی اور خیر خواہی برتنے اور ان کے ساتھ دھوکہ دہی سے اجتناب کرنے سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ان جیسے اصولوں کا خیال کرنے والی قیادت اپنی قوم کو کامیابی سے ہمکنار اور آخرت میں سرخرو کر سکتی ہے۔

اصول نمبر ۱۰ : شوریٰ کی پاسداری

اجتماعی معاملات میں مشاورت اور اسلام کی جمہوری روح کو مدِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر عباس مدنی رحمۃ اللہ علیہ شوریٰ کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"قائد خواہ کتنا ہی بااختیار ہو، نازک پوزیشن میں مبتلا ہو جاتا ہے، بلکہ بڑے بڑے اہل عقل ودانش اپنی عقل و تدبر اور حکمت و تجربے کے باوجود ان مسائل و مشکلات کے آگے سراسیمہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان مسائل ومشکلات کے بارے میں کوئی موقف اختیار کرنے کے بعد حکمران کو ندامت سے بچانے اور قوم کو بدانجامی سے محفوظ رکھنے کے لیے اسلام میں مشورہ لازم کر دیا گیا ہے " (۳)

شوریٰ کی اس اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِذَا كَانَ أُمَرَاؤُكُمْ خِيَارَكُمْ، وَأَغْنِيَاؤُكُمْ سُمَحَاءَكُمْ، وَأُمُورُكُمْ شُورَى بَيْنَكُمْ فَظَهْرُ الأَرْضِ خَيْرٌ لَكُمْ مِنْ بَطْنِهَا» (۴)

جب تمہارے امراء اچھے لوگ ہوں ، تمہارے معاشرے کے خوشحال افراد فیاض ہوں، اور تمہارے

---

(۱) ابو نعیم احمد، مسند مستخرج علی صحیح مسلم، قال محقق: إِسْنَادہ حَسَنٌ، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۹۶ء، ۱/ ۲۰۹
(۲) صحیح بخاری، بَابُ مَنِ اسْتَرْعَى رَعِيَّةً، حدیث نمبر: ۷۱۵۱، ۹/ ۸۰
(۳) عباس مدنی، ڈاکٹر، جدید نظریات کی شکست اور اسلامی نظام کی ضرورت، ادارہ معارف اسلامی، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص: ۱۶۱
(۴) سنن ترمذی، حدیث نمبر: ۲۲۶۶، ۴/ ۵۲۹

معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہوں، تو یقیناً تمہارے لیے زمین کی پشت زمین کی گود سے بہتر ہے۔

اس حدیث میں تین امور کو مسلم معاشرے کے لیے دنیا و آخرت کی سعادت کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے۔ اگر کسی معاشرے میں یہ تینوں اجتماعی امور موجود ہوں تو وہ فلاح و کامرانی سے ہمکنار ہو گا:

۱۔ خدا ترس قیادت و حکومت ۲۔ فیاض اور غریبوں کے ہمدرد اصحابِ دولت

۳۔ اور تمام اجتماعی معاملات میں مشاورت و جمہوریت کی روح کار فرما ہو[۱]

اسلام میں شوریٰ کی بڑی اہمیت ہے، اس لیے اللہ تعالی نے نبی ﷺ کو اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشاورت کا حکم دیا ہے۔ نیز عمومی انتظامی معاملات مشورے سے طے کرنے کا حکم صادر فرمایا ہے:

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾[۲]

اور دین کے کام میں ان کو بھی شریکِ مشورہ رکھو۔

﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ﴾[۳]

اور ان (مسلمانوں) کا کام باہمی مشورے سے ہوتا ہے۔

حضرات مفسرین لکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو مشورہ لینے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ امت کے لیے شورائیت کی سنت قائم ہو جائے اور آئندہ امت آمریت کے راستے پر نہ چلے۔ شوریٰ کے شرعی قاعدے پر سختی کے ساتھ قائم رہے اور آپ ﷺ کی سنت کو نمونہ عمل بنائیں۔ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

" اللہ تعالی کو معلوم تھا کہ آپ ﷺ کو ان کے مشورے کی حاجت نہیں لیکن اس نے چاہا کہ آنے والوں کے لیے یہ سنت رہے "[۴]

مولانا گوہر رحمان رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

" خلفائے راشدین، صحابہ اور تبع تابعین کی یہ مستقل پالیسی تھی کہ اجتماعی امور میں ذاتی رائے کی بجائے شوری کی رائے کو ترجیح دیتے تھے۔۔۔ اور خلافت راشدہ کے دور میں امناء اور اہلِ علم کی مجلسِ شوری موجود تھی "[۵]

دینی امور میں حکمران پر اہلِ علم سے مشورہ لینا واجب ہے۔ جنگی امور میں ماہرین جنگ سے، عوام کی بہبود کے کاموں میں عوامی نمائندوں سے اور ملکی مصالح یعنی تعمیر و ترقی کے کاموں میں سیکٹریوں، وزیروں اور ماتحتوں

---

(۱) انتخابِ حدیث، ص:۳۳۲

(۲) سورۃ آل عمران:۱۵۹

(۳) سورۃ الشوری:۳۸

(۴) آلوسی، محمود، امام، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۴/ ۱۰۶

(۵) اسلامی سیاست، ص:۲۸۹

سے مشورہ لینا چاہئیے [۱] کیونکہ ملک وملت کی ترقی کا راز اسی میں ہے کہ اجتماعی امور میں مشاورت کا طریقہ اپنایا جائے۔ تاکہ قوم کی اجتماعی دانش سے فائدہ اٹھا کر بعد میں ناکامی کا سبب لیڈر کو قرار نہ دیا جائے۔ سب کو مل کر قوم کو مشکل سے نکالنے کے لیے غور وخوض سے کام لینے کا موقعہ دیا جائے۔ جس کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَا خَابَ مَنِ اسْتَخَارَ، وَلَا نَدِمَ مَنِ اسْتَشَارَ» [۲]

جس نے استخارہ کر لیا وہ نامراد نہیں ہو گا اور جس نے مشورہ کر لیا وہ نادم نہیں ہو گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر وہ کام جو مشورہ سے انجام پاتا ہے اس میں ضرور خیر و بھلائی ہو گی ۔

اصول نمبر ۱۱ : عرف عام (رعایا اور ریاست کے مزاج) سے واقفیت

چونکہ ریاستی قیادت ذمہ دار افراد ہوتے ہیں اور معاملاتِ ریاست میں دخیل اور اہم فیصلوں کا اختیار ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ان کا رعایا اور ریاست کے احوال، عرف اور رسم ورواج سے باخبر ہونا ضروری ہے، تاکہ کسی بھی معاملے میں کوتاہی کے مرتکب ہو کر ریاست و رعایا کا نقصان نہ کریں ۔ قیادت رعایا کے لیے بمنزلہ وکیل ہے۔ کامیاب وکیل وہی ہوتا ہے جو کیس کی تمام تر تفصیلات سے واقف ہو۔ چنانچہ مشارق الأنوار میں ہے:

"النقيب العريف وهو شاهد القوم و ضمينهم" [۳]

نقیب عریف کو کہتے ہیں جو قوم کے معاملات کا نگران اور ذمہ دار ہوتا ہے۔

مولانا گوہر رحمان رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

" جو شخص نہ لوگوں کے رسم ورواج اور عرفِ عام سے واقف ہو، نہ حالاتِ حاضرہ کا علم رکھتا ہو اور نہ بین الاقوامی امور سے واقف ہو، وہ ریاست کے اس اہم ترین قانون ساز اور پالیسی ساز ادارے کے فرائض پورے نہیں کر سکے گا " [۴]

لہذا اسلامی ریاست کی قیادت کو رعایا کے حالات اور معاملات سے باخبر رہنے کے ساتھ ساتھ گہری بصیرت کا بھی حامل ہونا چاہئیے۔

اصول نمبر ۱۲ : ریاست اور رعایا کا اعتماد

مسلمانوں اور اسلامی ریاست کا وقار اس وقت بلند ہوتا ہے، جب ان کی اجتماعیت قائم ہے اور اجتماعی بقا کے لیے ریاستی قیادت کو اکثریت کا اعتماد بھی حاصل ہو۔ اس سلسلے میں مولانا گوہر رحمان رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"عرفاء اور نقباء وہی ہو سکتے ہیں جو اہلیت کے ساتھ معتمد بھی ہو، جس طرح کوئی شخص صرف اہلیت اور

---

(۱) ابو عبد اللہ، محمد بن احمد بن ابی بکر، تفسیر قرطبی، دار الاحیاء التراث، بیروت ۴/ ۲۴۹

(۲) طبرانی، سلیمان بن احمد، المعجم الاوسط، تحقیق: طارق عوض اللہ وغیرہ، دار الحرمین، قاہرہ، ۶/ ۳۶۵

(۳) سبتی، عیاض بن موسی، مشارق الانوار علی صحاح الآثار، المکتبۃ العتیقۃ، دار التراث، ۲/ ۲۳

(۴) اسلامی سیاست، ص: ۳۰۱

قابلیت کی بناء پر از خود کسی کا وکیل نہیں بن سکتا، جب تک کہ موکل نے اس پر اعتماد کر کے اپنا وکیل نہ بنایا ہو۔ اسی طرح نقیبِ قوم اور عریفِ قوم یعنی قومی نمائندہ صرف اپنی ذاتی قابلیت کی وجہ سے رکن شوریٰ نہیں بن سکتا، جب تک کہ اسے اپنی علاقے کے لوگوں کا اعتماد حاصل نہ ہو جائے "(۱)

بہترین قائد اسے قرار دیا گیا ہے، جس سے ریاست کے عوام الفت و محبت رکھتے ہو اور وہ رعایا سے محبت رکھتا ہو۔ چنانچہ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

«خِيَارُ أَئِمَّتِكُمْ الَّذِينَ تُحِبُّونَهُمْ وَيُحِبُّونَكُمْ وَيُصَلُّونَ عَلَيْكُمْ وَتُصَلُّونَ عَلَيْهِمْ»(۲)

تمہاری بہترین قائد وہ لوگ ہیں، جن سے تم محبت کرو اور وہ تم سے۔ تم ان کے لیے دعائے خیر اور وہ تمہارے لیے دعائے خیر کریں۔

ان راہنماؤں کی حیثیت اور شخصیت ایسی ہونی چاہئیے کہ جمہور امت ان کی پیروی کر رہی ہوں اور ان کے ارد گرد جمع ہو سکیں۔ اس سلسلے میں امام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"سب سے اہم بات یہ ہے کہ لوگ خلیفہ سے خوش ہوں، اس کے ارد گرد جمع ہوں، اس کی عزت کریں اور یہ کہ وہ حدود کو جاری کرے۔ ملت کا دفاع کرے اور احکام نافذ کرے "(۳)

یہ بات طے شدہ ہے کہ ایک فعال اور پائیدار اقتدار اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا، جب تک زمانے کے ایک معتبر اکثریت اس کا ساتھ نہ دے، جو ہر زمانے میں معتبر سمجھے جاتے ہیں۔

ریاستی قیادت کے انتخاب میں ایسے افراد کو ترجیح دینی چاہئیے جو چاہے زیادہ پرہیز گار نہ ہوں، تاہم قوم کو متحد کرنے اور مصالحِ امت کی اچھی طرح محافظت کر سکتے ہوں۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

" صحابہ رضی اللہ عنہم میں بہت سے ایسے لوگ تھے جو اپنی نیکی، عبادت گزاری اور زہد و جانثاری کے باعث اپنے ساتھیوں میں ممتاز تھے۔ تاہم نہ تو وہ نظم و نسق اور حکومتی معاملات کا طبعی رجحان رکھتے تھے نہ تجربہ۔ لہذا نہ تو انہیں کوئی عہدہ دیا گیا، نہ کوئی اور سرکاری ذمہ داری۔ اس کے برخلاف حضور نبی کریم ﷺ نے سرکاری عہدے ایسے لوگوں کو دیے جو یقیناً نیکی، دینی علم اور اللہ سے ڈرنے میں حضرت ابو ہریرہ، عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کے ہم پلہ نہیں تھے "(۴)

---

(۱) اسلامی سیاست، ص:۳۰۲

(۲) صحیح مسلم، باب: خِيَارُ أَئِمَّتِهِ وشرارہم، حدیث نمبر:۳۴۴۷

(۳) شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ، دار احیاء العلوم، بیروت، لبنان، ۱۹۹۲ء، ۲/۳۹۸

(۴) غازی، محمود احمد، ڈاکٹر، منتخب مقالات، دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، ص:۳۴

اصول نمبر ۱۳: اجتہادی بصیرت کا حامل ہونا

کسی بھی ریاست کے قائد اور تحریک سے وابستہ افراد میں بیک وقت علم و دانش اور جذبہ صادقہ دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ نہ تو محض جذبے سے سرشار ہجوم فائدہ مند ہے اور نہ محض مجلس ہائے دانش سے ہی انقلاب کشیدہ ہوتے ہیں۔ قیادت کو چاہیئے کہ جذبہ و دانش میں خلیج کو پاٹنے کے لیے حکمتِ عملی بنائے۔ بصیرت، حکمت، پختہ سوچ، تجزیہ، اصابت رائے، اگر قوتِ عمل میں نہ ڈھلے تو سرگرمیاں ہوں گی، مگر ثمر آور نہ ہو سکیں گی۔ جذبہ تو ہو گا مگر موثر نہ ہو سکے گا۔ تحریک تو ہو گی مگر پیش قدمی نہ ہو گی۔[۱] ان سب کا تعلق اجتہادی بصیرت سے ہے۔

علم و دانش کے ساتھ ساتھ جذبہ صادقہ وہ حرکی قوت ہے، جس سے نبی ﷺ اور ان کے ساتھیوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اسلام کو چار دانگ عالم میں پھیلایا اور اصول و ضابطے کی حکمرانی ممکن بنائی۔ یہی انسانیت کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ جس سے انسانیت ناواقف ہو چکی تھی۔ اس پاکیزہ تحریک کی قیادت نے مختلف المزاج، خصوصیات اور اصحابِ بصیرہ افراد کی ایک عالمی تحریک برپا کی، جو انسانیت کی نجات[۲] کا سبب بن گئی۔ قیادت پر فائز افراد ریاست، تحریک اور جماعتوں کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ سوچنے سمجھنے والے افراد اس کا دماغ ہیں۔ دونوں کی ہم آہنگی اجتہادی بصیرت کا مظہر ہے۔

اصول نمبر ۱۴: سادگی اور تواضع

ظاہر و باطن کی پاکیزگی، تصنع سے اجتناب اور وضع و قطع کی سادگی وہ عوامل ہیں، جو انسانی اور دیگر مادی وسائل کو ضائع ہونے سے بچاتے ہیں۔ دنیا کی عظیم شخصیات نے سادہ زندگی گزار کر قیادت کی ذمہ داریاں خوب نبھائی اور زندگی کے پر پیچ راستوں پر سفر کرتے ہوئے، افراط و تفریط کے شکار انسانوں کو پاکیزہ تحریک کا حصہ بنایا۔ جس سے قوم نے کامیاب زندگی گزارنے کا سلیقہ سیکھا۔ محمدِ مصطفی ﷺ ایسے ہی دور میں تشریف لائے کہ دنیا افراط و تفریط کی شکار، آقا و غلام، کالے گورے، شاہ و گدا اور عربی و عجمی کے بندھنوں میں گرفتار تھی۔ آپ ﷺ کی تحریک نے ان کو مٹا کر جانثار و پاکباز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں تبدیل کیا۔ جن کی سادہ زندگی رہتی دنیا تک کے انسانوں کے لیے منارہ نور اور اعلیٰ معیار بن گئی۔ صحابہ نے تمام شعبہ ہائے زندگی میں کمال سادگی سے کام لیا۔ رسول اللہ ﷺ کی سادگی تو بے ہی مثالی۔ ایک دن کسی نے کھانے کی کوئی چیز بھیجی، رکھنے کے لیے کوئی چیز نہ ملی تو فرمایا کہ زمین پر رکھو اور ساتھ فرمایا:

« فَإِنَّمَا هُوَ عَبْدٌ يَأْكُلُ كَمَا يَأْكُلُ الْعَبْدُ، وَيَشْرَبُ كَمَا يَشْرَبُ الْعَبْدُ» [۳]

میں تو اللہ کا ایک غلام (بندہ) ہوں، اور بندوں کی طرح کھاتا اور پیتا ہوں۔

---

(۱) ماہنامہ ترجمان القرآن، مقالہ ارشد احمد بیگ، نومبر ۲۰۱۴ء، ص: ۵۳

(۲) سورۃ آل عمران: ۱۰۳

(۳) ابو بکر بن ابو شیبہ، مسند، حدیث نمبر: ۹۶۳، تحقیق: عادل یوسف، دار الوطن، ریاض، طبع اول: ۱۹۹۷ء، ۲/ ۴۲۴

خلفائے راشدین نے آپ ﷺ کے نقشِ قدم پر چل کر امتِ مسلمہ اوراس کے سربراہوں کے لیے سادگی کا اعلی معیار قائم کیا۔ رعایا کی خبر گیری ہو یا ان کی حقوق کی حفاظت و نگہداشت، بیت المال یا ریاست کی حدود کی حفاظت، نہایت خلوصِ دل سے ان ذمہ داریوں کو نبھا کر ان کا حق ادا کیا۔ ان کے نقشِ قدم پر چل کر قائدین امت کو سادہ زندگی اپنانا وقت کا اہم تقاضا ہے۔ اس وقت خود پسندی اور تصنع نے امت کو تباہی کے دھانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ اس بات کی نشاندہی آقائے دوجہاں ﷺ نے ان الفاظ میں کی ہے:

«مَنْ تَوَاضَعَ لِلهِ دَرَجَة ،رَفَعَهُ اللهِ دَرَجَة ،حَتى يَجْعَلَهُ فِي عِلِّيينَ، وَمَنْ تَكبرَ عَلَى اللهِ دَرَجَة، وَضعه اللهِ دَرَجَة، حَتَّى يَجعَلَهُ فِي أَسفَلِ السافِلِينَ»(۱)

جس نے اللہ کے لئے ایک درجہ تواضع اختیار کی، اللہ اسے ایک درجہ بلند کرے گا، یہاں تک کہ اسے اعلیٰ علیین میں پہنچائے گا۔ اور جس نے ایک درجہ تکبر اختیار کیا، اللہ اسے ایک درجہ ذلیل کرے گا، تاوقتیکہ اسے اسفل السافلین میں پہنچادے۔

حضرت قیس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب شام میں اپنے اونٹ پر سوار ہو کر تشریف لائے، تو آپ رضی اللہ عنہ کا استقبال کر کے لوگوں نے کہا کہ امیر المومنین اگر آپ رضی اللہ عنہ ترکی گھوڑے پر سوار ہو کر آئے اور اس حال میں سردارانِ قوم اور زعماء آپ رضی اللہ عنہ سے ملاقات کریں (تو اچھا ہو گا)۔ آپ رضی اللہ عنہ نے سخت سرزنش کرتے ہوئے فرمایا:

«لاَ أَرَاكُمُ هَاهُنَا ، إِنَّمَا الأَمْرُ مِنْ هَا هُنَا ، وَأَشَارَ بِيَدِهِ إِلَى السَّمَاءِ،خَلُّوا سَبِيلَ جَمَلِي»(۲)

میں تم کو یہاں نہ دیکھوں، آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: فیصلے وہاں سے آتے ہیں، میرے اونٹ کا راستہ چھوڑو۔

خلاصہ بحث

آج امت مسائل کے گرداب میں پھنسی ہوئی ہے۔ ان مسائل سے خلاصی کے لیے مضبوط انتظامی ڈھانچے کی ضرورت ہے۔ یہ انتظامی ڈھانچہ قائم کرنا سیاست دانوں اور وقت کے حکمرانوں کا کام ہے۔ اس وقت تک یہ ممکن نہ ہو گا، جب تک حکمران خود اور اپنا طرزِ حکومت اسوہ حسنہ اور خلفائے راشدین کے طرزِ حکمرانی کے موافق نہ کر لیں۔ اس مقالہ میں اسلامی تعلیمات، اسوہ حسنہ اور خلفائے راشدین کے طرز حکومت سے چند اصول اخذ کیے گئے ہیں۔ یہ اصول آج امتِ مسلمہ کے حکمرانوں کے لیے رہنمائی فراہم کرنے کا ذریعہ ہوسکتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حکمران ان اصولوں کو اپنائیں۔ جتنا جلد وہ شرعی طرزِ حکومت اپنائیں گے، اتنا جلد امت کے مسائل کم اور وسائل

(۱) ابن حجر، احمد بن علی عسقلانی، الامالی المطلقۃ، تحقیق: حمدی عبد المجید، المکتب الاسلامی، بیروت، طبع اول: ۱۹۹۵ء، ۱/ ۸۹
(۲) السنۃ، ابو بکر احمد بن محمد الخلال، تحقیق: عطیہ بن عتیق الزہرانی) دار الرایۃ، ریاض، طبع دوم: ۱۹۹۴ء، ۲/ ۳۱۷

بڑھیں گے۔ آج مسلم ممالک غلط طرزِ حکمرانی کے باعث باہم دست و گریبان ہیں۔ غیر مسلم حکمرانوں کی سادگی اور مسلم زعماء کی شاہ خرچیوں کی امثلہ زبان زدعام ہیں۔ عوام کو سیاسی اور معاشی مسائل میں الجھا کر حکمران اپنے مسائل پر توجہ مرکوز رکھے ہوئے ہیں۔ اغیار ہمارے نبی کی طرزِ حکمرانی اپنا کر ترقی کے مزے لوٹ رہے ہیں۔

الغرض! اسلامی تعلیمات کی روشنی میں قیادت کے لیے درج ذیل تجاویز پیش خدمت ہیں:

۱- حاکمیت الٰہی کے قیام کی پاسداری کریں، یہی عقیدہ توحید کا تقاضا ہے۔

۲- رنگ و نسل اور دیگر امتیازات و عصبیتوں کو مٹائے اور رعایا میں اسلامی وحدت واخوت کو فروغ دیا جائے۔

۳- امانت و دیانت کی رَوِش کو فرغ دیا جائے تاکہ استحکامِ ریاست اور نظم وضبط کے قیام میں آسانی ہو۔

۴- عدل وانصاف اور مساوات جیسے معاشرتی عوامل کو مد نظر رکھا جائے اور اس کے عملی نفاذ کی سعی کی جائے۔

۵- خود غرضی اور لالچ سے دور اور عرف عام سے باخبر رہے تاکہ تمام اجتماعی کوششیں بے اثر ہو کر نہ رہ جائیں۔

۶- اطاعتِ شریعت کو مد نظر رکھیں تاکہ ریاست میں امن و سلامتی اور استحکام ہو اور رعایا میں نظم وضبط قائم رہے۔

۷- اجتماعی طور پر ریاست میں خدا خوفی کا ماحول پیدا کیا جائے اور رعایا کی خدمت اخلاص کے ساتھ کی جائے۔

۸- ریاست میں اصول پسندی کو رواج دیا جائے تاکہ رعایا میں ہم آہنگی وہمکاری کو ممکن بنایا جاسکے۔

۹- ملنساری، شگفتہ مزاجی، نرم خوئی اور خیر خواہی، سادگی اور تواضع جیسی صفات کو فروغ دیا جائے۔

۱۰- دھوکہ دہی جیسے رذائلِ اخلاق کی حوصلہ شکنی کی جائے اور رعایا کا اعتماد بحال کرنے کی کوشش کی جائے۔

۱۱- علم ودانش کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ جذبہ صادقہ سے قوم کو سرشار کرنے کی کوشش کی جائے۔

رسول اللہ ﷺ کے اشارات : معنوی اور صوری تفہیم !

Gesturers of the Holy Prophet (ﷺ): Virtual and Visual Apprehension

مزمل کامران *
ڈاکٹر شاہ معین الدین ہاشمی **

ABSTRACT

The life of the Holy Prophet Muhammad (ﷺ) is a primary source of guidance for Muslim *Ummah*. Prophetic guidance is not restricted to the verbal instructions only but he has at times used the Gestures to express and explain the things. This is a significant area of Hadith sciences which deals with the gestures and body Language of the Prophet (ﷺ). His companions (R.A) not only preserved his verbal instructions, dictated words, silent approvals, and actions of their beloved Prophet (ﷺ) but they also preserved his (ﷺ) gestures and body language. This paper discusses the Gestures of the Holy Prophet with special reference to their virtual and visual interpretations. The purpose of this research is to critically analyze the Gestures of the Holy prophet and their importance in communicating the message to the audience. The method used for this research paper is descriptive and analytical. The analysis of the prophetic traditions revealed that there have been significant examples in Hadīth where Prophet (ﷺ) used the gestures to explain his words and thoughts which helped in conveying the message. Visual explanations and diagrams of some of the gestures have also been included in the article to explore and highlight their significance. This article reveals that use of gestures is helpful in communicating the message to the audience, and this aspect of *Sīrah* must be utilized during interactive sessions and verbal discussions. Furthermore, current research paper recommends that adequate body language and Gestures are the vital means of teaching, *tablīgh*, and successful communication in the light of *Sīrah* studies.

Key Words: *Gesticulation, Prophetic Gestures, Visual Explanation, Virtual Interpretations, Sīrah*

* پی ایچ۔ڈی سکالر، شعبہ علوم اسلامیہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
** ایسوسی ایٹ پروفیسر، چیئرمین شعبہ سیرت سٹڈیز، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

رسول ﷺ کی حیات مبارکہ قرآن کی حقیقی تعبیر و تفسیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ نے رسول اللہ ﷺ کی سنت اور سیرت کی حفاظت کے لئے انتہائی عرق ریزی اور جانفشانی سے کام لیا اور تدریجاً ایسے اصول و ضوابط اور فنون مرتب کیے جو گہری نظر میں ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَه لَحٰفِظُوْن﴾[1] کا عملی اور حقیقی مصداق نظر آتے ہیں۔ انہی نعمتوں اور کاوشوں میں ایک ضبط و روایت حدیث بھی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نہ صرف دین متین کی حفاظت کے پیش نظر سنت اور سیرت کی حفاظت کیا کرتے تھے بلکہ حب رسول ﷺ بھی اس کا محرک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور بعد کے رواۃ نے نہ صرف آپ ﷺ کے قول، فعل اور تقریر کو محفوظ کیا بلکہ دوران گفتگو آپ کے اشارات، چہرے کے تاثرات، جذبات اور احساسات کو بھی بھرپور انداز میں محفوظ کیا اور آگے روایت کیا۔

یہ ایک تحقیق طلب موضوع ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دوران گفتگو جسمانی اشارات و حرکات Gestures یا Body Language کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کس طرح محفوظ کیا اور کس طرح اس سے معانی اور مطالب کو سمجھنے میں مدد لی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سیرت طیبہ کے اس پہلو کو حدیث نبوی ﷺ کے بیان کے دوران جس حزم و احتیاط اور خوبصورتی سے امت تک پہنچایا، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب کوئی ایسی روایت نقل فرماتے جس میں حضور ﷺ کی طرف سے کوئی جسمانی اشارہ بھی منقول ہو تو اس اشارہ کا بیان عین اس وقت لاتے جب قول کے دوران وہ عملاً کیا گیا ہو۔ مثلاً حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

> «أن رسول الله ﷺ قال:في الجمعة ساعة – وقبض أطراف أصابعه، وهو يقللها – لايسأله فيها مؤمن شيئاً إلا أعطي سؤله»[2]
>
> بے شک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جمعہ کے دن میں ایک ایسا لمحہ ہے اور آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں کے اطراف کو بند کیا اس طرح کہ آپ اس لمحے کے قلیل ہونے کی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ مومن بندہ اس لمحے میں اللہ سے جو بھی مانگے اس کو عطا کیا جاتا ہے۔

اس روایت سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس قول کے دوران رسول اللہ ﷺ نے ہاتھ کی انگلیوں کے سروں کو بند کر کے قلت کی طرف کیسے اشارہ کیا ہو گا کیونکہ عین اسی وقت راوی در راوی وہ اشارہ اور اس کی کیفیت نیز اشارے کا مدلول و مقصود اسی انداز میں بیان گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے اشارات کی ہیئتِ معنوی اور ہیئتِ صوری کی تفہیم اور اس موضوع کی اہمیت کے پیش

---

(۱) سورۃ الحجر:۹

(۲) ابن وہب، عبد اللہ المصری القرشی، الجامع، رفعت فوزی عبد المطلب، کتاب الصلوۃ، حدیث نمبر:۲۲۸، دار الوفاء، ۱/۱۳۳

نظر ذیل میں بطور نمونہ چند منتخب روایات پر بحث پیش خدمت ہے۔

(۱) دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے ذریعے تشبیک کا اشارہ:

ایک مومن کا دوسروں کے ساتھ تعلق وربط کیسا ہونا چاہیے اس کی وضاحت کے لیے آپ ﷺ نے ہاتھوں کی انگلیوں کے ذریعہ اشارہ فرمایا۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

«الْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ، يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا » ثم شبّك بين أصابعه»[۱]

ایک مومن دوسرے مومن کے لیے اس طرح ہے جیسے عمارت، کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو تھامے رہتا ہے (گرنے نہیں دیتا) پھر آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں کو قینچی کی طرح کر لیا۔

اس روایت میں رسول اللہ ﷺ کا ایک اشارہ نقل کیا گیا ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں یہ روایت حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جبکہ معجم الاوسط میں اسی طرح کا مفہوم حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔[۲]

تشبیک کی ہیئتِ معنوی

دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم ایک دوسرے کے اندر ڈال کر مضبوطی سے پکڑ لینے کو تشبیک کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے دونوں ہاتھوں کے اس اشارے کو اتحاد، تراحم اور یکجہتی کے استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ جس طرح ایک عمارت کے بعض حصے دوسرے حصوں کے ساتھ باہم پیوست ہوتے ہیں اور ان کی یہ پیوستگی مجموعی طور پر عمارت کی مضبوطی کا سبب بنتی ہے اسی طرح انگلیوں میں انگلیاں ڈال کر مضبوطی اور باہمی یگانگت کو سامعین کے لئے ایک حد تک مرئی اور قابل دید بنا دیا گیا۔ یعنی سامعین کی آسانی کیلئے نبی ﷺ نے اوّلاً مؤمنین کی مودّت کو مضبوط عمارت کے ساتھ قولی تشبیہ کے طور پر بیان فرمایا، پھر ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر علی وجہ الاتم سامعین پر اپنے مدعا کو واضح فرما دیا کہ جس طرح ایک ہاتھ کی انگلیاں متعدد ہونے کے باوجود اصل واحد کی طرف لوٹتی ہیں اسی طرح اہل ایمان اگرچہ اشخاص کے لحاظ سے متعدد ہیں لیکن ان کی اصل نسب اور ایمان کے اعتبار سے ایک ہی ہے یعنی نوح و آدم علیہما السلام۔[۳]

تشبیک کی ہیئت صوری :

روایت میں بیان کیا گیا اشارہ ذیل میں دی گئی صورت سے تشابہ ہے[۴]:

---

(۱) بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، کتاب الادب، باب تعاون المومنین بعضہم بعضا، حدیث نمبر:۶۰۲۶، دار طوق النجاۃ، ۱/ ۱۲

(۲) طبرانی، سلیمان بن احمد، المعجم الاوسط، باب المیم، حدیث نمبر:۵۷۱۸، دار الحرمین، قاہرہ، ۶/ ۳۵

(۳) ابن حجر، احمد بن علی العسقلانی، فتح الباری شرح صحیح البخاری، دار المعرفۃ، بیروت، ۱۰/ ۴۵۰

(۴) بظاہر یہ حدیث مبارک ان احادیث کے متعارض محسوس ہوتی ہے جن میں دوران نماز یا مسجد میں تشبیک سے منع کیا گیا ہے۔ مغلطائی فرماتے ہیں: تحقیق یہ ہے کہ ان احادیث کے درمیان تعارض نہیں ہے۔ کیونکہ نہی کا تعلق دوران نماز تشبیک سے ہے اور زیر بحث حدیث مبارک میں تشبیک نہ نماز کے دوران ہے نہ نماز کے انتظار کے دوران۔

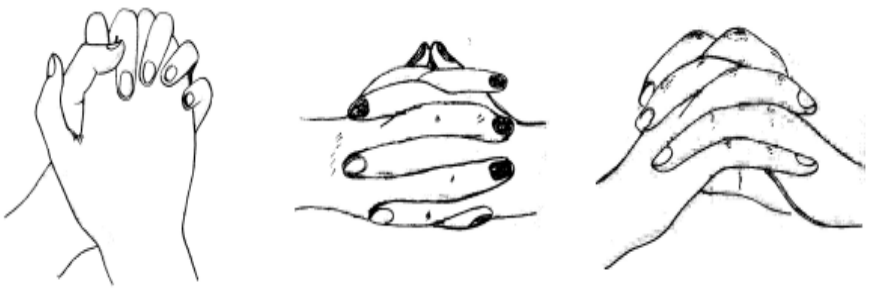

(۲)ہاتھ کی انگلی کے ذریعے منہ کی طرف اشارہ

کمال ابلاغ کیلئے آپ ﷺ نے کلام کے ساتھ ساتھ اپنے دست مبارک کی انگلیوں کے ذریعے اشارے فرمائے۔

مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ:

«سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ، يَقُولُ:«تُدْنَى الشَّمْسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنَ الْخَلْقِ، حَتَّى تَكُونَ مِنْهُمْ كَمِقْدَارِ مِيلٍ»- قَالَ سُلَيْمُ بْنُ عَامِرٍ: فَوَاللهِ مَا أَدْرِي مَا يَعْنِي بِالْمِيلِ؟ أَمَسَافَةَ الْأَرْضِ، أَمِ الْمِيلَ الَّذِي تُكْتَحَلُ بِهِ الْعَيْنُ - قَالَ: «فَيَكُونُ النَّاسُ عَلَى قَدْرِ أَعْمَالِهِمْ فِي الْعَرَقِ، فَمِنْهُمْ مَنْ يَكُونُ إِلَى كَعْبَيْهِ، وَمِنْهُمْ مَنْ يَكُونُ إِلَى رُكْبَتَيْهِ، وَمِنْهُمْ مَنْ يَكُونُ إِلَى حَقْوَيْهِ، وَمِنْهُمْ مَنْ يُلْجِمُهُ الْعَرَقُ إِلْجَامًا» قَالَ: وَأَشَارَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِيَدِهِ إِلَى فِيهِ»[1]

حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ ﷺ فرماتے ہیں قیامت کے دن سورج مخلوق سے اس قدر قریب ہو جائے گا یہاں تک کہ ان سے ایک میل کے فاصلے پر ہو جائے گا سلیم بن عامر کہتے ہیں اللہ کی قسم میں نہیں جانتا کہ میل سے کیا مراد ہے زمین کی مسافت کا میل مراد ہے یا سلائی جس سے آنکھوں میں سرمہ ڈالا جاتا ہے آپ ﷺ نے فرمایا: لوگ اپنے اپنے اعمال کے مطابق ٹخنوں تک پسینہ میں غرق ہوں گے اور ان میں سے کچھ لوگوں کے گھٹنوں تک پسینہ ہو گا اور ان میں سے کسی کی کمر تک اور ان میں سے کسی کے منہ میں پسینہ کی لگام ہو گی راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ مبارک سے اپنے منہ مبارک کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔[2]

---

(۱) مسلم بن حجاج قشیری، صحیح مسلم، کتاب الجنتہ وصفۃ نعیمھا واھلھا، باب صفۃ یوم القیامۃ اعاننا اللہ علی اھوالھا، حدیث نمبر:۲۸۶۴، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۴/۲۱۹۶

(۲) یہ روایت مبارکہ دو صحابہ کرام حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ اور مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، (عینی، محمود بن احمد، عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۲۳/۱۱۰)

اشارے کی ہیئت معنوی

اس حدیث مبارکہ میں آپ ﷺ نے قیامت کے دن کی ہولناکی کا ذکر فرمایا ہے کہ سورج مخلوق سے ایک میل کی مسافت پر ہو گا۔ سخت گرمی کے باعث تمام انسانیت اپنے اعمال کے بقدر پسینہ میں ڈوبی ہوئی ہو گی، ان میں سے بعض ٹخنوں تک اور بعض گھٹنوں تک، بعض سرین تک پسینے میں شرابور ہوں گے۔ اور بعض گردنوں اور منہ تک پسینے سے شرابور ہوں گے۔

مختصراً یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے قیامت کے دن ان لوگوں کی اس حالت زار کو اشارے سے بیان فرمایا۔

حدیث مبارک میں سورج کے قریب آجانے کی وجہ سے لوگوں کی جس کسمپرسی کی منظر کشی کی گئی ہے اس میں لوگوں کے اعمال کا دخل بھی شامل ہے۔ یعنی بعض لوگ ایسے ہوں گے جو اپنے اعمال کی وجہ سے پشیمان اور پریشان ہوں گے اور ٹخنوں تک پسینے سے شرابور ہوں گے اور بعض وہ ہوں گے جو اپنے قبیح اعمال کی وجہ سے زیادہ بری حالت میں ہوں گے، حتیٰ کہ انتہائی برے اعمال کی وجہ سے بعض لوگ گردن اور بعض منہ تک پسینے سے شرابور ہوں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان انتہائی پریشان حال لوگوں کی حالت کو منہ کی طرف انگلی کا اشارہ کر کے بتایا۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق یہ انتہائی بری حالت کے لوگ کافر ہی ہوں گے، لیکن مؤمنین کیلئے اس دن خاص تخفیف کی جائے گی۔[1] اور اسی طرح علامہ عینی نے امام قرطبی کی طرف بھی اسی قول کو منسوب کیا ہے۔

لفظ میل سے مراد: سرمہ دانی کی سلائی ہے جس کے ذریعہ آنکھ میں سرمہ لگایا جاتا ہے۔ تین فرسخ کی مسافت کا فاصلہ۔ دو نامزد علامتوں کے درمیان زمین کا ٹکڑا۔ تاحد نظر وسعت۔[2]

اشارے کی ہیئتِ صوری

اس حدیث مبارک میں رسول ﷺ نے جو اشارہ فرمایا ہے وہ درج ذیل صورت سے واضح ہے۔ اشارہ ایک ہاتھ کی انگلی سے کیا گیا، انگلی سے منہ کی طرف اشارہ کیا گیا، انگلی سے منہ کی طرف کیا جانے والا یہ اشارہ روز قیامت ان کفار کی حالت زار پر دلالت کرتا ہے جو روز قیامت اپنے کفر اور حالت بد کی وجہ سے پسینہ میں شرابور ہوں گے۔

(۳) دو انگلیوں کے ذریعے اشارہ

آپ ﷺ نے یتیم کی کفالت کرنے والے کے انعام کی وضاحت محض دو انگلیوں کے اشارے سے

---

(۱) ابن الملقن، عمر بن علی بن احمد الشافعی، التوضیح لشرح الجامع الصحیح، دار النوادر، دمشق، سوریا، طبع اول: ۲۰۰۸ء، ۴۹/۳۰

(۲) عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، ۱۱۱/۲۳

فرمادی۔ جیسا کہ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيمِ فِي الْجَنَّةِ هَكَذَا». وَقَالَ بِإِصْبَعَيْهِ السَّبَّابَةِ وَالْوُسْطَى[1]

میں اور یتیم کی پرورش کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے اور آپ نے شہادت اور درمیانی انگلیوں کے اشارہ سے ((قرب کو)) بتایا)۔

یہ روایت حضرت ابوہریرہ[2]، حضرت سہل بن سعد، حضرت ام سعد بن مرۃ الفہریہ[3]، حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہم[4] سے مروی ہے۔

اس روایت مبارکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیم کی کفالت کیلئے ترغیباً اشارہ فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اشارہ دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں کو اٹھا کر ان میں باہم تھوڑا سا فاصلہ ڈال کر، یتیم کی کفالت کرنے والے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت میں ساتھ ساتھ ہونا بتاتا ہے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرے میں ناداروں، اور ضعفاء کی کفالت کرنے کی عمومی فضا قائم کرنے کے لئے بالخصوص یتیم کی کفالت کرنے والے کو جنت میں اپنے ساتھ کی خوشخبری دی اور معیت کے اس مفہوم کو انتہائی بلیغ اور خوبصورت انداز میں سامعین کے سامنے ہاتھ کی دو انگلیوں سے اشارہ کرکے واضح فرمادیا۔

اشارے کی ہیئت معنوی

اس حدیث مبارک میں موجود یہ اشارہ شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی پر مشتمل ہے۔ بعض روایات میں اشارے کی ہیئت واضح کرتے ہوئے راوی دو انگلیوں کے مابین فاصلے کو صراحت سے بیان کرتے ہیں جیسا کہ صحیح بخاری کی روایت میں ہے «وفرج بينهما شيئا» اور بعض اوقات راوی ان دو انگلیوں کے مابین فاصلہ نہ ہونے کو بیان کرتے ہیں جیسا کہ روایت کے الفاظ سے ثابت ہے «وجمع بين إصبعيه السبابة والوسطى»۔[5]

ایک روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے «وَأَنَا وَكَافِلُ اليَتِيمِ فِي الجَنَّةِ هَكَذَا »[6] یعنی یتیم کی کفالت کرنے والے کیلئے یہ فضیلت ہر حال میں ہے، وہ یتیم اس کا اپنا قریبی رشتہ دار ہو یا اس کا غیر ہو تب بھی فضیلت اس کو حاصل ہو گی۔ خواہ کافل یتیم کی کفالت اپنے ذاتی مال سے کرے یا ولایت شرعیہ حاصل ہو جانے کی وجہ سے یتیم کے مال سے کرے ہر دو حال میں کافل مذکورہ بالا فضیلت کا حقدار ہو گا۔ البتہ ایک روایت کی رو سے کفالت

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الادب، باب فضل من یعول یتیما، حدیث نمبر:۶۰۰۵

(۲) شیبانی، احمد بن حنبل، مسند، حدیث نمبر:۸۸۸۱، تحقیق:شعیب الارنؤوط، عادل مرشد، وآخرون، اشراف:د. عبد اللہ بن عبد المحسن الترکی، مؤسسۃ الرسالۃ، طبع اول:۲۰۰۱ء، ۱۴/۴۶۵

(۳) شیبانی، احمد بن عمرو، الآحاد والمثانی، حدیث نمبر :۸۳۸، دار الرایۃ، ریاض، ۲/۱۲۶

(۴) بغوی، حسین بن مسعود فراء، شرح السنۃ، کتاب البر والصلۃ، باب ثواب کافل الیتیم، حدیث نمبر:۳۴۵۴، المکتب الاسلامی، بیروت، دمشق، ۱۳/۴۳

(۵) الآحاد والمثانی، حدیث نمبر: ۸۳۸، ۲/۱۲۶

(۶) صحیح بخاری، کتاب الطلاق، باب اللعان، حدیث نمبر:۵۳۰۴، ۷/۵۳

پر اس فضیلت کے حصول کو تقویٰ کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے یعنی یتیم کے حقوق کی ادائیگی میں کافل تقویٰ کا خیال رکھے۔[۱]

ایک روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«أنا وامرأة سفعاء الخدين، كهاتين يوم القيامة»[۲]

یعنی ایسی عورت جس کا شوہر وفات پا گیا ہو اور وہ باوجود حسن، حسب و نسب اور منصب کے وہ دوسری شادی پر قدرت کے باوجود بچوں کی تعلیم و تربیت کیلئے اپنے آپ کو دوسری شادی سے باز رکھے، اور محنت و مشقت کے اثرات اس کے چہرے سے واضح ہوں، حتیٰ کہ وہ بچے اس سے جوان ہو کر مستغنی ہو جائیں تو ایسی عورت کے لئے بھی رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق یہی فضیلت ہے۔

اشارے کی ہیئتِ صوری

حدیث مبارکہ میں بیان کیے گئے اشارے کی ہیئت صوری درج ذیل دو طریقوں سے واضح کی جاسکتی ہے۔

۱۔ رسول اللہ ﷺ نے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں (درمیانی انگلی اور شہادت کی انگلی) سے اشارہ فرمایا اس حال میں کہ وہ دو انگلیاں باہم ملی ہوئی تھیں اور ہتھیلی مبارک سامعین کی طرف تھی جیسا کہ درج ذیل صورت سے واضح ہے۔

۲۔ رسول اللہ ﷺ نے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے اشارہ فرمایا اس حال میں کہ وہ دو انگلیاں باہم جدا تھیں۔ اور ہتھیلی مبارک سامعین کی طرف تھی جیسا کہ درج ذیل صورت سے واضح ہے۔

(۱) ابن علان، محمد علی البکری، دلیل الفالحین لطرق ریاض الصالحین، باب ملاطفۃ الیتیم، حدیث نمبر: ۲۶۲۳، دار المعرفۃ، بیروت، ۸۱/۳

(۲) احمد حطیبۃ، شرح ریاض الصالحین، دروس صوتیۃ قام بتفریغہا موقع الشبکہ الاسلامیہ، ۹/۱۱

(۴)دو ہاتھوں سے اشارہ

رمضان کے ماہ مقدس اور روزوں کی گنتی کے لئے آپ ﷺ نے دونوں ہاتھوں سے اشارہ فرمایا۔ جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

«أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ ذَكَرَ رَمَضَانَ، فَضَرَبَ بِيَدَيْهِ فَقَالَ: «الشَّهْرُ هَكَذَا، وَهَكَذَا، وَهَكَذَا – ثُمَّ عَقَدَ إِبْهَامَهُ فِي الثَّالِثَةِ – فَصُومُوا لِرُؤْيَتِهِ، وَأَفْطِرُوا لِرُؤْيَتِهِ، فَإِنْ أُغْمِيَ عَلَيْكُمْ فَاقْدِرُوا لَهُ ثَلَاثِينَ »[۱]

نبی کریم ﷺ نے رمضان المبارک کا ذکر کیا تو اپنے دونوں ہاتھوں کے ساتھ اشارہ کر کے فرمایا یہ مہینہ اس طرح ہے اور اس طرح ہے اور اس طرح ہے پھر تیسری مرتبہ اپنے انگوٹھے کو بند کر کے فرمایا کہ چاند دیکھ کر روزے رکھو اور چاند دیکھ کر افطار (عید) کرو اور اگر مطلع ابر آلود ہو تو تم پر تیس روزے کی تعداد پوری کرنا لازم ہے۔

اس حدیث مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ کا دونوں ہاتھوں سے ایک اشارہ کرنے کا ذکر ہے۔ اشارے کا تعلق مہینے کے دنوں کی گنتی سے ہے۔ دونوں ہاتھوں سے رسول اللہ ﷺ نے تین مرتبہ اشارہ فرمایا، پہلے دو مرتبہ میں دونوں ہاتھوں کی تمام انگلیاں سامعین کے سامنے کھول دیں، اور تیسری مرتبہ میں ایک ہاتھ کا ایک انگوٹھا بند کر کے اس طرف اشارہ دیا کہ مہینہ انتیس دنوں کا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی آپ ﷺ نے مزید ارشاد فرمایا کہ اگر مطلع ابر آلود ہو تو تیس کی گنتی کو پورا کر لیا جائے۔ حدیث مبارکہ میں مروی یہ اشارہ تشریح طلب ہے۔ اور جب تک اشارے کی ہیئت معنوی اور ہیئت صوری معلوم نہ ہو جائے حدیث کا مضمون سمجھا نہیں جا سکتا۔

اشارے کی ہیئت معنوی:

اسی روایت کے ایک طریق میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے :

«إِنَّا أُمَّةٌ أُمِّيَّةٌ لَا نَكْتُبُ، وَلَا نَحْسُبُ، الشَّهْرُ هَكَذَا وَهَكَذَا وَهَكَذَا"وَعَقَدَ الْإِبْهَامَ فِي الثَّالِثَةِ وَالشَّهْرُ هَكَذَا وَهَكَذَا وَهَكَذَا يَعْنِي تَمَامَ ثَلَاثِينَ »[۲]

یعنی ایک بار رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مہینہ اتنا، اتنا اور اتنا ہوتا ہے اور اتنے کا مفہوم ہاتھوں سے اس طرح بیان کیا کہ دو بار دونوں ہاتھوں کی تمام انگلیاں پھیلا دیں جبکہ تیسری مرتبہ میں انگوٹھا بند کر دیا اور اس طرف اشارہ فرمایا کہ مہینہ انتیس دنوں کا بھی ہو سکتا ہے۔ دوسری مرتبہ پھر ہاتھوں سے اشارہ کیا اور اس موقع پر تینوں مرتبہ دونوں ہاتھوں کی تمام انگلیاں پھیلا دیں یوں مہینے میں دنوں کی تعداد تیس بیان فرمائی۔

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب وجوب صوم رمضان لرؤیۃ الہلال والفطر لرؤیۃ الہلال، حدیث نمبر:۱۰۸۰، ۲/۷۵۹

(۲) مسند احمد، حدیث نمبر:۵۰۱۷، ۹/۵۹

اشارہ کی ہیئت صوری

حدیث مبارکہ کے مختلف طرق کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مہینے کی تعداد بتانے کے لئے اشارہ ایک نہیں دو ہیں۔

ایک اشارے میں تین بار ہاتھوں کی تمام انگلیوں کو کھولا گیا اور مہینے میں دنوں کی تعداد تیس بتائی گئی۔ جبکہ دوسرے اشارے میں دو بار ہاتھوں کی تمام انگلیوں کو کھولا گیا اور تیسری بار انگوٹھے کے علاوہ بقیہ تمام انگلیوں کو کھولا گیا اور یوں مہینے میں دنوں کی تعداد انتیس بتائی گئی۔

اور یہ دونوں اشارے درج ذیل صورت سے واضح ہوتے ہیں۔

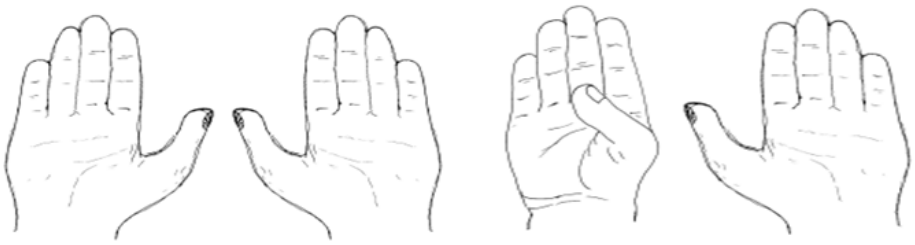

(۵) اللہ جل شانہ کی عظمت وشان کی طرف انگلیوں کے ذریعے اشارہ

« أَتَى رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَعْرَابِيٌّ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، جُهِدَتِ الْأَنْفُسُ، وَضَاعَتِ الْعِيَالُ، وَنُهِكَتِ الْأَمْوَالُ، وَهَلَكَتْ الْأَنْعَامُ، فَاسْتَسْقِ اللَّهَ لَنَا فَإِنَّا نَسْتَشْفِعُ بِكَ عَلَى اللَّهِ وَنَسْتَشْفِعُ بِاللَّهِ عَلَيْكَ، قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: «وَيْحَكَ أَتَدْرِي مَا تَقُولُ؟» وَسَبَّحَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ، فَمَا زَالَ يُسَبِّحُ حَتَّى عُرِفَ ذَلِكَ فِي وُجُوهِ أَصْحَابِهِ، ثُمَّ قَالَ: «وَيْحَكَ إِنَّهُ لَا يُسْتَشْفَعُ بِاللَّهِ عَلَى أَحَدٍ مِنْ خَلْقِهِ، شَأْنُ اللَّهِ أَعْظَمُ مِنْ ذَلِكَ، وَيْحَكَ أَتَدْرِي مَا اللَّهُ، إِنَّ عَرْشَهُ عَلَى سَمَاوَاتِهِ لَهَكَذَا» وَقَالَ بِأَصَابِعِهِ مِثْلَ الْقُبَّةِ عَلَيْهِ «وَإِنَّهُ لَيَئِطُّ بِهِ أَطِيطَ الرَّحْلِ بِالرَّاكِبِ» قَالَ ابْنُ بَشَّارٍ فِي حَدِيثِهِ: «إِنَّ اللَّهَ فَوْقَ عَرْشِهِ، وَعَرْشُهُ فَوْقَ سَمَاوَاتِهِ» وَسَاقَ الْحَدِيثَ، وَقَالَ عَبْدُ الْأَعْلَى: وَابْنُ الْمُثَنَّى، وَابْنُ بَشَّارٍ، عَنْ يَعْقُوبَ بْنِ عُتْبَةَ، وَجُبَيْرِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ جُبَيْرٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَدِّهِ وَالْحَدِيثُ بِإِسْنَادِ أَحْمَدَ بْنِ سَعِيدٍ هُوَ الصَّحِيحُ وَافَقَهُ عَلَيْهِ جَمَاعَةٌ مِنْهُمْ يَحْيَى بْنُ مَعِينٍ، وَعَلِيُّ بْنُ الْمَدِينِيِّ، وَرَوَاهُ جَمَاعَةٌ عَنِ ابْنِ إِسْحَاقَ، كَمَا قَالَ أَحْمَدُ، أَيْضًا وَكَانَ سَمَاعُ عَبْدِ الْأَعْلَى، وَابْنِ الْمُثَنَّى، وَابْنِ بَشَّارٍ مِنْ نُسْخَةٍ وَاحِدَةٍ فِيمَا بَلَغَنِي»[1]

---

(۱) سجستانی، ابو داود، سلیمان بن اشعث، کتاب السنۃ، باب فی الجہمیۃ، حدیث نمبر: ۴۷۲۶، مکتبہ عصریہ، صیدا، بیروت، ۴/ ۲۳۲

رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک دیہاتی آدمی آیا اور کہا کہ یارسول اللہ ﷺ لوگ مشقت میں پڑ گئے، گھر بار، اموال کم ہوگئے اور مویشی ہلاک ہوگئے، پس آپ ﷺ اللہ سے ہمارے لیے بارش طلب فرمائیں ہم اللہ کے پاس آپ ﷺ کی سفارش چاہتے ہیں، اور اللہ کی سفارش آپ ﷺ کے پاس چاہتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تیرا ستیاناس ہو، جانتا ہے تو کیا کہہ رہا ہے؟ اور رسول اللہ ﷺ نے اللہ کی تسبیح بیان کی اور مسلسل تسبیح اور پاکی بیان کرتے رہے یہاں تک کہ اس بدو کی غلط بات کا اثر آپ ﷺ کے صحابہ کے چہروں پر بھی ظاہر ہونے لگا پھر آپ نے فرمایا کہ تجھ پر افسوس ہے اللہ کی سفارش نہیں کی جاتی کسی پر اس کی مخلوقات میں سے۔ اللہ کی شان اس سے کہیں زیادہ عظیم ہے۔ تجھ پر افسوس ہے کیا تو جانتا ہے کہ اللہ کا عرش اس کے آسمانوں پر اس طرح ہے اور آپ نے اپنی انگلیوں سے گنبد نما اشارہ کر کے بتایا؛ اور بیشک وہ عرش الٰہی چرچراتا ہے جس طرح کہ کجاوہ سواری کے بیٹھنے سے چرچراتا ہے۔ محمد بن بشار نے اپنی روایت میں فرمایا کہ بیشک اللہ اپنے عرش کے اوپر ہے اور اس کا عرش آسمانوں کے اوپر ہے اور آگے اسی طرح حدیث بیان کی۔

ہیئتِ معنوی

اس حدیث مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ نے ایک سادہ فہم دیہاتی آدمی کے قول پر گرفت فرمائی، جب اس نے کہا ہم اللہ کے سامنے آپ ﷺ کو سفارشی بناتے ہیں اور آپ ﷺ کے سامنے اللہ کو سفارشی بناتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے اس بدو کا قول سننے میں ایسا انداز اختیار کیا کہ تمام حاضرین محفل نہ صرف متوجہ ہوگئے بلکہ اس بدو کی غلطی سے آگاہ بھی ہوئے اور سراپا انتظار ہوئے کہ اب رسول اللہ ﷺ کس طرح اس سادہ فہم شخص کو اس کی غلطی پر متنبہ فرماتے ہیں، اور کس طرح اس کی اصلاح کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تجھ پر افسوس! اللہ کو اس کی مخلوق کے سامنے بطور سفارشی پیش نہیں کیا جاتا۔ پھر اللہ جل شانہ کی عظمت کو رسول اللہ ﷺ نے اس بدو کے لیے اپنے دست مبارک اور اپنی انگلیوں کے اشارے سے اور ایک ایسی مثال کے ذریعہ واضح کیا جو اس دیہاتی کے حسب حال تھی کہ اس کو اونٹ اور کجاوے سے روزانہ ہی واسطہ پڑتا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ آدمی بھاری بھر کم اور وزنی جسم والا ہو اور جب کجاوے پر بیٹھتا ہو گا تو کجاوہ چرچراتا ہو گا۔ اس کی سادہ فہمی کو دیکھتے ہوئے کجاوے کی مثال دی گئی۔

اشارہ:

آپ ﷺ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں سے قبہ نما شکل بنا کر اللہ رب العزت کے عرش کو اس قبہ سے تشبیہ دی اور دوسرے ہاتھ کو سیدھا کھول کر آسمان سے تشبیہ دی۔ اور فرمایا:

"بیشک اللہ جل شانہ اپنے عرش کے اوپر ہے اور وہ عرش آسمانوں کے اوپر ہے۔"

مثال:

چنانچہ آپ ﷺ نے اس دیہاتی کے علم و فہم کو سامنے رکھتے ہوئے عظمت باری تعالی کے لیے نہایت بلیغ مثال ارشاد فرمائی کہ جس طرح کجاوہ پر وزنی سواری بیٹھ جائے یا وزنی سامان رکھا جائے تو کجاوہ ایک مخصوص آواز دیتا ہے جو گویا کجاوے کی عاجزی اور کمزوری کا منہ بولتا ثبوت ہوتی ہے۔

علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر رسول اللہ ﷺ کے اس کلام کو ظاہر پر محمول کیا جائے تو اس سے اللہ جل شانہ کی ذات اور صفات کیلئے ایک کیفیت ثابت ہوتی ہے، جبکہ اللہ جل شانہ کی ذات اور صفات، کیفیت سے پاک اور منزہ ہے، لہٰذا رسول اللہ ﷺ کا یہ کلام اس بدو کیلئے اللہ کی عظمت اور شان و شوکت کے تصور کے قریب الی الذہن بتانے کیلئے ہی ہو گا۔[1]

اس روایت کے رُواۃ میں محدث ابن اسحاق ایک راوی ہیں جن کے بارے میں علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ نے مدلس ہونے کی صراحت کی ہے، اور فرمایا: کہ یہ روایت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی صحیح میں نہیں لائے، جبکہ تاریخ ابن کثیر میں انہوں نے اس روایت کو ذکر فرمایا ہے۔ اگرچہ احمد بن عبد اللہ العجلی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

"ابن إسحاق ثقة، وقد اشهد مسلم بخمسة أحاديث ذكرها لابن إسحاق في صحيحه، وقد روى الترمذى فى جامعه من حديث ابن إسحاق"

بہر حال یہ مضمون ایک اور روایت سے بھی ثابت ہے جو کہ درج ذیل ہے۔

«فقال مُحَمَّد بن عبد الله الكوفي المعروف بمطين:حدثنا عبد الله بن الحكم وعثمان قالا:حدثنا يحيى عن إسرائيل عن أبي إسحاق عن عبد الله بن خليفة عن عمر قال:أتت النبي امرأة فقالت: ادع الله أن يدخلني الجنة فعظّم أمر الرب ثم قال: إن كرسيه فوق السماوات والأرض، وإنه يقعد عليه فما يفصل منه مقدار أربع أصابع، ثم قال بأصابعه فجمعها:وإن له أطيطا كأطيط الرحل»[2]

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ اللہ رب العزت کی کرسی اللہ کی عظمت و شان کی وجہ سے ایسے چرچراتی ہے جیسے وزن کی وجہ سے کجاوہ چرچراتا ہے۔

ہیئتِ صوری

علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

---

(۱) خطابی، حمد بن محمد بن ابراہیم، معالم السنن شرح سنن ابی داود، المطبعۃ العلمیۃ، حلب، طبع اول: ۱۹۳۲ء، ۴/ ۳۲۸

(۲) عظیم آبادی، شرف الحق، محمد اشرف بن امیر، عون المعبود شرح سنن ابی داود، کتاب السنۃ، باب فی الجہمیۃ، دار الکتب العلمیہ، طبع دوم: ۱۴۱۵ء، بیروت، ۱۳/ ۱۳

"وهي الهيئة الحاصلة للأصابع الموضوعة على الكف"

اس اشارے میں جو ہیئت صوری ہے وہ انگلیوں کو ہتھیلی پر (مثل القبہ) رکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔[۱]

یہی روایت ایک اور طریق سے بھی آتی ہے جس میں یحیی بن معین نے ہاتھ کی پانچ انگلیوں کے ذریعہ مثل قبہ کر کے دکھایا۔[۲]

اس روایت کے متون اور شروحات کے مطالعہ کے بعد جو ہیئت صوری سامنے آتی ہے وہ درج ذیل اشکال سے واضح ہوتی ہے۔

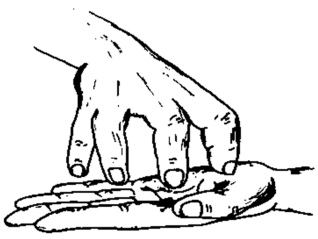

خلاصہ بحث

مذکورہ بالا احادیث کے مطالعہ سے رسول اللہ ﷺ کے مختلف اشارات کی ہیئت معنوی اور ہیئت صوری کی اہمیت کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ ایسی روایات جن میں کلام کی تفہیم محض اشارے پر ہی موقوف ہے، ان میں اس تحقیقی کام کی حیثیت مزید بڑھ جاتی ہے۔ خاص کر انسانی تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ جو نئے معاشرتی فنون وعلوم سامنے آئے ہیں ان میں غیر لسانی مواصلات (Nonverbal Communications) کو ایک مستقل حیثیت حاصل ہو چکی ہے اور سیرت طیبہ کا اس تناظر میں مطالعہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ غیر لسانی مواصلات اور اس کی اقسام کے تناظر میں ان روایات کا مطالعہ کیا جائے تو سیرت طیبہ کا نیا باب افشاں ہوتا ہے۔

❁ ❁ ❁

(۱) طیبی، شرف الدین حسین بن عبد اللہ، الکاشف عن حقائق السنن، کتاب احوال القیامۃ وبدء الخلق، باب بدء الخلق وذکر الانبیاء، حدیث نمبر: ۵۷۲۷، مکتبہ نزار مصطفی الباز، مکہ، ۱۱/ ۳۶۲۵

(۲) طبرانی، المعجم الکبیر، حدیث نمبر: ۱۵۴۷، مکتبہ ابن تیمیہ، طبعہ ثانیہ، قاہرہ، ۲/ ۱۲۸

سیرت طیبہ ﷺ کی روشنی میں تصورِ فلاح و بہبود

The Concept of Welfare in the Light of *Sīrat-al-Nabī*

ڈاکٹر ضیاء الرحمن*

ABSTRACT

Islam is the religion of welfare. It emphasizes on accomplishing the rights of human beings concurrently the rights of Allah. Similarly, the government and the member of society jolted regarding this collectively. And everyone is stimulated concerning his responsibilities and adjudges the followers just like one body. Islamic community is just like a cooperative society. It is a duty of everybody to assist the deprived not only financially but also ethically. Until, to meet affably is declared charity. The leader of Islamic state is the responsible for the welfare of everybody. Rather he is bound to feed every being. That is why *Haḍrat 'Umar* said that he is liable in the Day of Judgment if a dog is died due to starvation in his regime. In the research paper, the concept of welfare has been manifested in the light of *Sīrat-al-Nabī*. The method adopted for the research is qualitative as well as descriptive. The Holy prophet urged the believers of Islam on mutual assistance in adverse times. In disaster situations, the responsibilities of every Muslim increase and he should devote his intention tooth, nail and body to rescue.

Key Words: *Welfare, Sīrat-al-Nabī, Muslim State, Rights.*

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

نبی کریم ﷺ کی بعثت سے قبل نادار غریب لوگ معاشرہ کا مظلوم ترین طبقہ تھا۔ آپ ﷺ نے عملی طور پر اس طبقہ کی دلجوئی فرمائی۔ یہ آپ ﷺ کی تعلیمات کا ہی ثمرہ تھا کہ دولت و ثروت بڑا ہونے کا معیار نہ رہا بلکہ تقویٰ معیار بنا۔ تعلیمات نبوی میں اس طبقہ سے ہمدردی و غمگساری کے پس پردہ ذاتی مفادات کا شائبہ تک نہیں، صرف اور صرف رضائے الٰہی مقصود ہے۔

آپ ﷺ نے اہل اسلام کو مشکل لمحات میں باہمی نصرت و اعانت کی ترغیب دلائی، اسی طرح اجتماعی طور پر معاشرہ کے افراد اور حکومت کو بھی اس سلسلہ میں ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا ہر ایک کو اس کی رعیت کے بارے میں ذمہ داریوں سے آگاہ کیا اور ساتھ ہی امت کو جسد واحد قرار دے کر اس جانب متوجہ کیا کہ دوسروں کے لئے خدمات سرانجام دینے والے درحقیقت اپنی ضروریات کی تکمیل کر رہے ہوتے ہیں۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«وَاللهُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِي عَوْنِ أَخِيهِ»[1]

جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے تو اللہ کی مدد اس کے شامل حال رہتی ہے۔

اسلامی معاشرہ ایک Co-Operative Society کی طرح ہے۔ ایک دوسرے کی مالی ہی نہیں، اخلاقی مدد کرنا بھی فریضہ ہے، اسی لئے تو خندہ پیشانی سے ملنے کو بھی صدقہ قرار دیا گیا۔ یہاں تو بچت کا تصور ہی یہ ہے کہ مخلوق خدا پر رضائے الٰہی کے لئے جو کچھ خرچ کیا جائے گا وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جمع ہوتا ہے۔ تعلیمات نبوی کے مطابق آسمان سے رحمت و برکت کا نزول انسانی خدمت پر موقوف ہے۔

فلاح کا مفہوم

فلاح، فلح سے ماخوذ ہے جو کہ ف ل ح کے مادہ سے ہے جس کے معنی راہ پانا، حاصل کرنا اور کامیابی حاصل کرنا ہیں۔[2]، قرآن مجید میں ہے:

﴿قَدْاَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا﴾[3]

وہ کامیاب ہو گیا جس نے اپنا تزکیہ کیا۔

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْ مِنُوْنَ﴾[4]

مومن کامیابی حاصل کر گئے۔

قرآن مجید کا تصورِ فلاح اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے اور اس فلاح کا تعلق صرف دنیاوی زندگی سے ہی

---

(۱) احمد بن حنبل، مسند احمد، حدیث نمبر: ۷۹۴۲، موسسۃ الرسالہ، بیروت، ۱۹۹۹ء، ۱۳/ ۳۲۵

(۲) ابنِ منظور افریقی، لسان العرب، دار صادر، بیروت، ۱۹۹۰ء، ۴/ ۵۴۷

(۳) سورۃ الشمس: ۹

(۴) سورۃ المؤمنون: ۱

نہیں بلکہ اُخروی زندگی پر بھی محیط ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ﴾ (۱)

جو جہنم سے بچ گیا اور جنت میں چلا گیا وہ کامیاب ہو گیا۔

رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے:

«يَا أَيُّهَا النَّاسُ قُولُوا: لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ، تُفْلِحُوا» (۲)

لوگو! لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہو کامیاب ہو جاؤ گے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ قرآنی تصور کے مطابق اصل کامیابی وہ ہے جس سے دوزخ سے نجات اور جنت کا حصول ممکن ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آیت ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا﴾ وہ کامیاب ہوا جس نے اپنا تزکیہ کیا، میں کامیابی کو تزکیہ سے مشروط کیا گیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے فرائض منصبی میں سے ایک منصب "یزکیھم" (۳) یعنی لوگوں کا تزکیہ کرنا بھی ہے تاکہ وہ ظاہری اور باطنی پاکیزگی حاصل کر کے دنیاوی اور اُخروی فلاح و کامیابی حاصل کر سکیں۔

فلاح و بہبود کا قرآنی و نبوی تصور

انسانیت کی خدمت نمود و نمائش کے لئے نہ ہو بلکہ مقصود و مطلوب رضائے الٰہی ہو۔ اس خدمت کے بعد نہ احسان جتلایا جائے اور نہ ہی ضرورت مند کو ذلیل و رسوا کیا جائے۔ خرچ کرنے والوں کی قرآن نے یہ خوبی بیان کی ہے:

﴿الَّذِيْنَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ ثُمَّ لاَيُتْبِعُونَ مَاأَنفَقُوا مَنّاً وَلاَ أَذًى لَّهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَرَبِّهِمْ وَلاَخَوْفٌ عَلَيهِمْ وَلاَ هُم يَحْزَنُون﴾ (۴)

جو لوگ اپنا مال راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں اور جو کچھ انہوں نے خرچ کیا ہو اس پر کوئی منت اور احسان نہیں جتلاتے اور اذیت نہیں پہنچاتے ان کی جزا ان کے پروردگار کے ہاں محفوظ ہے اور انہیں کوئی خوف اور نہ وہ غمگین ہوتے ہیں۔

فلاح و بہبود کے کاموں میں ریاکاری اور نمود و نمائش سے بچنا از حد ضروری ہے کیونکہ رسول اکرم ﷺ نے ریاکاری کو شرک کی قسم قرار دیا ہے اور ایک ریاکار کے لئے احادیث میں بہت سخت وعید آئی ہے۔ جہنم کے نچلے درجے میں ایک ریاکار سخی بھی ہو گا۔

---

(۱) سورۃ آل عمران: ۱۸۵

(۲) مسند احمد، باب حدیث ربیعہ بن عباد الدیلی، حدیث نمبر: ۱۶۰۲۳، ۲۵ / ۴۰۴

(۳) سورۃ الجمعہ: ۲

(۴) سورۃ البقرۃ: ۲۶۲

اسلام یہ قطعاً پسند نہیں کرتا کہ انسانی خدمت کے ایسے ذرائع اختیار کئے جائیں جو جائز نہیں بلکہ حرام ہیں۔ اسی لئے باطل ذرائع آمدن سے کی گئی خدمت اللہ کے ہاں قبول نہیں جیسا کہ سورہ بقرہ میں ہے:

﴿يسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيْرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَايُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ كَذَلِكَ يُبيِّنُ اللهُ لَكُمُ الآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ﴾(۱)

آپ سے شراب اور جوئے کی نسبت سوال کرتے ہیں، فرما دیں: ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے کچھ (دنیوی) فائدے بھی ہیں مگر ان دونوں کا گناہ ان کے نفع سے بڑھ کر ہے، اور آپ سے یہ بھی پوچھتے ہیں کہ کیا کچھ خرچ کریں؟ فرما دیں: جو ضرورت سے زائد ہے (خرچ کر دو)، اسی طرح اللہ تمہارے لئے (اپنے) احکام کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ تم غور و فکر کرو۔

اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ نے اس نکتہ کی بڑی خوبصورتی سے وضاحت کی:

"کہ اس آیت نے اسلامی شریعت کا یہ مزاج واضح کر دیا کہ جو چیزیں اخلاقی اعتبار سے مضر ہیں اگر ان سے کوئی فائدہ بظاہر بنی نوع انسان کو پہنچتا بھی ہو یا پہنچایا بھی جا سکتا ہو تب بھی ان کے ضرر کے پہلو کے غلبہ کے سبب اسلام میں ان سے احتراز ہی واجب ہے"۔(۲)

اسلام اعتدال پسند دین ہے افراط و تفریط سے یہ فرد اور معاشرہ دونوں کو پاک دیکھنا چاہتا ہے۔ امت وسط(۳) اعتقادی اور عملی دونوں جہتوں سے میانہ رو ہے۔ اسی تناظر میں یہ بات بھی درست ہو گی کہ " فلاح و بہبود" دین اسلام کے مختلف شعبہ جات میں سے ایک شعبہ ہے، کل دین نہیں بلاشبہ اس کا مقام اور اجر بہت زیادہ ہے لیکن دین کے دیگر تقاضوں کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ "خدمت خلق کل دین نہیں ہے" کے عنوان سے جلال الدین عمر انصری لکھتے ہیں:

"اسلام کی بنیاد عقائد کے بعد اعمال صالحہ پر ہے لیکن تمام اعمال صالحہ ہی درجہ اور ایک ہی حیثیت کے نہیں ہیں"۔

انسانی فلاح کا عملی اظہار خدمت خلق کی شکل میں رُونما ہوتا ہے اور اس بارے میں تعلیمات نبوی و

---

(۱) سورۃ البقرۃ: ۲۱۹

(۲) اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۴۰۳ھ، ۱/۴۷۱

(۳) سورۃ البقرۃ: ۱۴۳

سیرت طیبہ ہمارے لیے بہترین رہنمائی کرتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فلاح و خدمت انسانیت کے لیے سنہری اُصول متعین کیے ہیں۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے:

«خَيْرُ النَّاسِ من يَنْفَعُ النَّاسِ»[1]

تم میں سے بہتر انسان وہ ہے جو لوگوں کو نفع دے۔

خدمت خلق کے یہ سنہرے اصول فلاح بنی آدم کا حقیقی مظہر ہیں، جن سے قوموں کی زندگیوں میں معاشی، معاشرتی، سماجی کامیابیاں رونما ہوتی ہیں۔ خدمت خلق کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔ انسان کی اپنی ذات، عزیز واقارب، پڑوسی، دوست احباب، عورت، غلام، قیدی، ذمی، غیر مسلم، جانور حتیٰ کہ فصلوں تک کے حقوق متعین کر کے دراصل خدمت خلق کا درس دیا گیا ہے۔ اِس میں انفرادی اور اجتماعی فلاح کا راز مضمر ہے۔ تمام ادیان میں لوگوں کی بھلائی کا تصور ہے۔

فلاح و بہبود کیلئے آپ ﷺ کے عملی اقدامات

انسانیت کا درد اور محبت خاندان رسالت مآب ﷺ کا ایک خصوصی امتیاز تھا۔ آپ ﷺ کے جد امجد قصی نے سقایہ اور رفادہ جیسے خالص فلاح و بہبود کے مناصب قائم کئے عبد مناف کو جو دوسخا کی بنا پر ''الفیاض'' کا لقب عطا کیا گیا۔

قبل از نبوت فلاح و بہبود کے عملی اقدام

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے عرب میں کوئی مضبوط سیاسی نظام نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے ایک سیاسی و سماجی انتشار پایا جاتا تھا، اور لوگوں کی جان ومال محفوظ نہ تھے، باز پرس کرنے والا کوئی نہ تھا، دورِ جہالت میں لوگوں پر ظلم و ستم اور ان کی حق تلفی بہت عام تھا۔ اس صورت حال کو بعض دردمند لوگوں نے بدلنا چاہا۔ مشورہ کے لیے عبداللہ بن جدعان کے مکان پر جمع ہوئے اور یہ فیصلہ کیا کہ ظلم وزیادتی کو ہر قیمت پر روکا جائے گا۔ کسی بھی شخص پر چاہے وہ مکہ کا رہنے والا ہو یا باہر سے آیا ہو ظلم نہیں ہونے دیا جائے گا۔ ظالم کے خلاف مظلوم کی حمایت کی جائے گی اور اسے اس کا حق دلوایا جائے گا اور ضرورت مندوں اور محتاجوں کی مدد کی جائے گی۔ رسول اللہ ﷺ بھی اس معاہدہ میں شریک تھے، یہ معاہدہ آپ ﷺ کی بعثت سے پہلے ہوا تھا۔

آپ ﷺ کے دل میں لوگوں کی خیر خواہی، بھلائی اور مظلوم کی مدد کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ چنانچہ دور جہالت میں ہونے والا یہ معاہدہ ''حلف الفضول'' کے نام سے معروف ہے۔ جس کا ذکر سیرت کی تقریباً تمام کتب میں ہے۔

(۱) علاؤالدین، علی بن حسام الدین، حدیث نمبر: ۴۴۱۵۴، کنزالعمال، دارالاشاعت، کراچی، ۱۶/ ۱۲۸

قاضی سلیمان منصور پوری نے "قیام امن و نگرانی حقوق کی انجمن کا انعقاد" کے عنوان سے اس معاہدہ کا جو منشور تحریر کیا وہ درج ذیل ہے:

۱۔ ہم ملک سے بد امنی دور کریں گے۔
۲۔ ہم مسافروں کی حفاظت کیا کریں گے۔
۳۔ ہم غریبوں کی امداد کرتے رہیں گے۔
۴۔ ہم زیر دست پر ظلم کرنے سے روکا کریں گے۔ (۱)

اس معاہدہ کے حوالہ سے سیرت نگاروں نے فلاح و بہبود عامہ کے پہلو کا ذکر کیا ہے۔

بعد از نبوت فلاح و بہبود کے عملی اقدام

بعد از نبوت آپ ﷺ نے نہ صرف چھوٹوں، بڑوں، والدین، اولاد، عورت، مرد، غلام نوکر، غیر مسلم بلکہ حیوانوں تک کے حقوق مقرر فرمائے۔ ان سے بھی آپ ﷺ کے جذبہ خیر خواہی کا علم ہوتا ہے۔ آپ ﷺ ہر ایک کے ساتھ خیر خواہی، ہمدردی اور حسنِ سلوک سے پیش آتے تھے۔ آپ ﷺ کو کسی نے دُکھ دیتے نہیں دیکھا بلکہ آپ ﷺ نے ہمیشہ ہی خیر و برکت کی باتیں کیں اور آپ ﷺ خدمت خلق کا باعث ہوئے۔

آپ ﷺ کا وجودِ مسعود ہی کائنات کے لیے رحمت تھا:

﴿وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ﴾ (۲)

اے نبی ﷺ، ہم نے آپ کو دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

آپ ﷺ نے تجارت میں لوگوں کی خیر خواہی کا پہلو سامنے رکھا۔ کبھی کسی کے سامنے جھوٹ نہیں بولا۔ کسی پر زیادتی نہ کی۔ مال میں کوئی نقص ہوتا تو بتا دیتے تھے۔ حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا کی تجارت کے لیے تشریف لے گئے تو وہاں بھی آپ ﷺ مال کے بارے میں ہر لحاظ سے وضاحت کرتے تھے۔

فلاح و بہبود کے لئے تعلیمی و تربیتی سرگرمیاں

قوموں کو اس وقت عروج حاصل ہوتا ہے جب علم میں ان کا مقام بلند ہوتا ہے۔ علم کی قدر و منزلت کی وجہ سے حضور ﷺ نے مسلمانوں کو علم کی طرف راغب کیا اور آنحضور ﷺ کے کئی اِرشادات ہیں جن سے علم کی اہمیت روزِ روشن کی طرح واضح اور عیاں ہو جاتی ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

---

(۱) منصور پوری، قاضی سلیمان، رحمۃ للعالمین، مرکز الحرمین الاسلامی، فیصل آباد، ۱/ ۴۳

(۲) سورۃ الانبیاء: ۱۰۷

«طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ»(۱)

علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

مسلمان پر حصولِ علم فرض قرار دیا تا کہ ایک مسلم دنیا کے رائج علوم میں ماہر ہو کر اپنی دنیوی اور اُخروی ہر زندگی کو آسان بنا سکے اور اپنے ملک اور قوم کی فلاح و کامیابی کے متعلق سوچے۔ اللہ تعالیٰ علم حاصل کرنے پر مسلمانوں کی حوصلہ افزائی یوں فرماتا ہے۔

﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَآءُ﴾ (۲)

حقیقت یہ ہے کہ بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اللہ سے ڈرتے ہیں۔

سیدنا صفوان بن عسال مرادی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے۔ انھوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ میں علم حاصل کرنے آیا ہوں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«فَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ تَضَعُ أَجْنِحَتَهَا لِطَالِبِ الْعِلْمِ رِضًى بِمَا يَصْنَعُ»(۳)

بے شک علم حاصل کرنے والے کے لیے فرشتے اپنے پر بچھا دیتے ہیں اس چیز سے خوش ہو کر جو وہ کرتا ہے۔

اصحاب صفہ کے ساتھ نبی کریم ﷺ کا تعلق بھی علم و عمل کی اہمیت پر روشنی ڈالتا ہے۔ مسجد نبوی ﷺ میں دو مجالس میں سے علم کی مجلس کو آپ ﷺ کا پسند کرنا بھی اہمیت علم کو واضح کرتا ہے۔ علم والی مجلس اور ذکر والی مجلس دونوں کی تعریف فرمائی لیکن خود علم والی مجلس میں تشریف فرما ہوئے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ رسول ﷺ نے فرمایا:

"علم حاصل کرو اور اس کے لیے سکون و وقار بھی سیکھو اور جن سے تعلیم حاصل کرتے ہو ان کا احترام کرو اور متکبر عالموں میں سے نہ بن جاؤ"۔ (۴)

اہل صفہ مومنین کا وہ جلیل القدر گروہ ہے کہ جن کے احوال خبر دیتے تھے کہ ایمان کی حلاوت جس کو نصیب ہو جائے پھر اسے اپنی مفلوک الحالی، بھوک، پیاس اور دیگر تعیشات زندگی کی کوئی پرواہ نہیں رہتی، نبی ﷺ نے مختلف اسلوب اختیار کر کے اس اقامتی ادارہ کے طلباء کی اعانت فرمائی۔ اس سلسلہ میں اسوۂ رسول ﷺ سے درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں۔

---

(۱) ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، باب فضل العلماء والحث علی طلب العلم، حدیث نمبر: ۲۲۴، دار احیاء الکتب العربی، بیروت، ۱/ ۸۱

(۲) سورۃ فاطر: ۲۸

(۳) نیشاپوری، امام حاکم، المستدرک علی الصحیحین، حدیث نمبر: ۳۴۱، دار الفکر، بیروت، ۱۹۹۰ء، ۱/ ۱۸۰

(۴) ابن عبد البر، جامع بیان العلم، دار الفکر، بیروت، ۱/ ۱۵۱

۱۔ ضرورت مندوں کی ضرورتوں کو پورا کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے۔
۲۔ زکوٰۃ اور دیگر صدقات و تکافل کا ذریعہ ہیں لیکن ان کے علاوہ دوست احباب سے ملنے والے تحائف و ہدایہ بھی ایثار کرتے ہوئے مساکین تک پہنچانے چاہئیں۔
۳۔ معاشرہ کے اہلِ ثروت اپنی استطاعت کے مطابق کسی ضرورت مند کی کفالت اپنے ذمے لیں۔
۴۔ ایسے افراد کے لئے روزگار کی فراہمی کے اسباب پیدا کئے جائیں تاکہ تدریجاً ایسے افراد کی تعداد میں کمی آسکے۔

مواخات مدینہ

نئے علاقہ اور نئے لوگوں میں، اپنے علاقہ اور اعزاء و اقربا کو چھوڑ کر آبسنا، یقیناً صاحبان ایمان و تقویٰ ہی کے بس میں تھا۔ مدینہ منورہ کی نئی فضاء میں بھی رسول خدا ﷺ نے انسانی احساسات و جذبات اور مشکلات و پریشانیوں کا خیال رکھا۔ ان حالات میں نبی رحمت ﷺ نے مہاجرین و انصار میں مواخات قائم کی۔ یہ مواخات کثیر المقاصد تھی اس کے سیاسی، سماجی، اخلاقی، معاشی اور جذباتی سبھی پہلو اہم تھے۔

مواخات کی فلاحی نوعیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر نصیر احمد ناصر لکھتے ہیں:

> "معیشت کی بنیاد "مواخاۃ" پر رکھی گئی تھی۔ مواخاۃ کا مطلب یہ ہے کہ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ لہذا انہیں معاشی زندگی اس طرح گزارنی چاہیے جس طرح ایک صالح کنبے کے افراد کو اخوت و مساوات کے اصول پر گزارنی چاہیے"۔ (۱)

شفاخانوں کا قیام

اسلام سے قبل عرب میں علاج کرانا ایک لحاظ سے ہر شخص کا ذاتی یا زیادہ سے زیادہ خاندانی مسئلہ تھا۔ جسے طاقت اور وسائل کے مطابق حل کیا جاتا تھا۔ شفاء خانوں یا ہسپتالوں کا وجود نہیں تھا۔ لیکن اسلام کی آمد کے بعد شفاء خانوں کی بنیاد پڑ گئی۔ صحابیہ حضرت رفیدہ رضی اللہ عنہا نے مسجد نبوی ﷺ کے پاس ایک خیمہ لگا رکھا تھا جس میں وہ محض ثواب کی خاطر جنگ میں زخمی ہونے والے ان افراد کی مرہم پٹی اور علاج کرتی تھیں جن کی نگہداشت کرنے والا کوئی نہ تھا۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ غزوہ خندق میں زخمی ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی قوم سے کہا کہ وہ انہیں اس خیمہ میں رکھیں تاکہ وہ قریب رہیں اور عیادت کرنے میں آپ ﷺ کو آسانی ہو۔ (۲)

مساجد کی تعمیر

مساجد کی تعمیر اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے کی جاتی ہے، اس کی تعمیر براہِ راست عبادت میں تعاون ہے، لیکن دورِ

---

(۱) نصیر احمد ناصر، پیغمبر اعظم و آخر ﷺ، فیروز سنز، لاہور، ص:۴۹۶
(۲) ابنِ ہشام، سیرۃ النبی ﷺ، ادارہ اسلامیات انار کلی، لاہور، ۲۵۸/۳

اول میں مساجد عبادت کے علاوہ مسلمانوں کے تعلیمی، سماجی اور سیاسی مراکز کی بھی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان کی حیثیت اب بہت کچھ بدل چکی ہے۔ رفاہی خدمات کے ذیل میں ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ بَنَى مَسْجِدًا يَبْتَغِي بِهِ وَجْهَ اللَّهِ بَنَى اللَّهُ لَهُ مِثْلَهُ فِي الجَنَّةِ»(۱)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کسی نے اللہ کی رضا کی طلب میں کوئی مسجد بنائی تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس طرح کا گھر جنت میں بنائے گا۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تعمیر مسجد بہت کارِ ثواب ہے۔ مسجد ایک بہت بڑا رفاہی ادارہ ہے، جس میں مسلمانوں کی عبادت و ملاقات سے لے کر معاملات کے فیصلے تک کیے جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ جب کبھی سفر سے واپس آتے تو پہلے مسجد میں تشریف لے جاتے، لوگوں سے ملتے ان کے حالات معلوم کرتے بعض فیصلے کرتے اور بعد ازاں گھر تشریف لے جاتے۔ مسجد کی ہر جگہ تعلیمی مرکز کی حیثیت ہونی چاہیے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ مسجد نبوی میں صفہ ایک ایسا ادارہ تھا جہاں خوراک اور لباس سے غریبوں کی مالی اعانت کی جاتی تھی۔ یہ بات بہت خوش آئند ہے کہ مغربی ممالک میں مساجد اخلاقی اداروں اور کمیونٹی سینٹرز کا کام سرانجام دے رہی ہیں۔ عبادت، تعلیم و تعلم اور شادی بیاہ جیسے امور وہاں سرانجام پاتے ہیں۔

سرائیں اور قیام گاہیں تعمیر کرنا

فلاحی خدمات میں سے ہوٹلوں اور مسافر خانوں کی تعمیر بھی ہے۔ جہاں مسافروں کو بہتر سہولتیں حاصل ہوں، اور دیس سے دوری کی وجہ سے انھیں مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے جس سے اس کا اجر و ثواب اور فضیلت ظاہر ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔

> "مومن کے مرنے کے بعد بھی جن اعمال اور نیکیوں کا ثواب اسے پہنچتا رہتا ہے ان میں یہ چیزیں بھی داخل ہیں۔ وہ علم جس کی اس نے تعلیم دی اور پھیلایا، نیک اولاد جو اس نے چھوڑی، قرآن مجید جس کا اُس نے اپنے بعد کسی کو وارث بنایا یا مسجد جو اس نے بنوائی یا مسافروں کے لیے کوئی مکان تعمیر کرایا یا نہر جو اس نے کھدوائی یا وہ صدقہ جو اس نے اپنے مال سے صحت کی حالت میں اپنی زندگی میں نکالا۔ اس کا ثواب اس کے مرنے کے بعد بھی ملے گا"۔(۲)

---

(۱) بخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح بخاری، باب من بنی مسجدا، حدیث نمبر: ۴۵۰، دار طوق النجاۃ، مصر، ۱۴۲۲ھ

(۲) ابن ماجہ، محمد بن یزید، سنن ابنِ ماجہ، بَابُ ثَوَابِ مُعَلِّمِ النَّاسَ الْخَيْرَ، حدیث نمبر: ۲۴۲، دار احیاء الکتب العربیہ، بیروت

اس حدیث میں فلاح و بہبود کے بعض خاص کاموں کا ذکر ہے، اور انھیں صدقہ جاریہ کہا گیا ہے۔ ان میں مسافروں کے لیے مکان اور سرائے کی تعمیر بھی ہے۔ ایک اور ارشاد نبوی ﷺ ہے:

«إِذَا مَاتَ الإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ: صَدَقَةٌ جَارِيَةٌ، وَعِلْمٌ يُنْتَفَعُ بِهِ، وَوَلَدٌ صَالِحٌ يَدْعُو لَهُ»(۱)

جب انسان انتقال کر جاتا ہے تو اس کے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں سوائے تین کے، صدقہ جاریہ یا وہ علم جو اس کو فائدہ دے یا نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی ہو۔

کنویں کھدوانا

پانی زندگی کی بنیادی ضرورت ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی صاف پانی کی فراہمی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اسلام نے اس کی طرف جس طرح توجہ دلائی ہے۔ اس کا اندازہ اُوپر کی اس روایت سے لگایا جاسکتا ہے جس میں بندگان خدا کے لیے نہر کی تعمیر کو صدقہ جاریہ کہا گیا ہے۔

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی والدہ کا انتقال ہوا تو انھوں نے چاہا کہ ان کی طرف سے صدقہ وخیرات کریں، رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کون سا صدقہ سب سے اچھا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کنواں کھدوانا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ماں کے نام سے کنواں کھدوایا۔(۲)

ذرائع آمدورفت کی درستگی

اسلام نے فلاحی خدمات کی ذمہ داری ریاست کے افراد پر ڈالی ہے اور ان افراد کو کہا گیا ہے کہ راستوں کو صاف رکھیں اور ان پر جو رکاوٹیں ہوں انھیں دور کریں۔ اس سلسلے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت معروف ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«الْإِيمَانُ بِضْعٌ وَسَبْعُونَ أَوْ بِضْعٌ وَسِتُّونَ شُعْبَةً، فَأَفْضَلُهَا قَوْلُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ، وَأَدْنَاهَا إِمَاطَةُ الْأَذَى عَنِ الطَّرِيقِ، وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْإِيمَانِ»(۳)

ایمان کی ستر یا ساٹھ سے اوپر شاخیں ہیں ان میں سے بہتر لا الہ الا اللہ ہے اور ادنیٰ شاخ راستہ سے تکلیف کو دور کرنا ہے۔ حیاء ایمان کی ایک شاخ ہے۔

---

(۱) ترمذی، محمد بن عیسی، سنن ترمذی، باب فی الوقف، حدیث نمبر: ۱۳۷۵-۱۳۷۶، شرکہ مکتبہ ومطبعہ مصطفی البابی الحلبی، مصر، ۱۹۷۵ء

(۲) ابو داؤد، سلیمان بن اشعث، سنن ابو داؤد، حدیث نمبر: ۱۵۳، المکتبہ العصریہ، صیدا، بیروت

(۳) قشیری، مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، باب شعب الایمان، حدیث نمبر: ۵۳، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱/۶۳

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آپ ﷺ نے تاکید کی کہ وہ راستے کو اس کا حق دیں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا راستے کا حق کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"آنکھوں کو نیچے رکھنا، راستے سے تکلیف دہ چیز کو دور کرنا اور بھٹکے ہوئے کی راہنمائی کرنا"(۱)

درخت لگانا

فلاح انسانیت میں سے لوگوں کے گزرنے میں آسانی پیدا کرنا بھی شامل ہے۔ گرمیوں میں سایہ کی سہولت درخت لگا کر مہیا کرنا، ماحول کو آلودہ ہونے سے بچانے کے لیے راستے کے کناروں پر درختوں کا لگانا بھی خلق خدا کی بھلائی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

«مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَغْرِسُ غَرْسًا، أَوْ يَزْرَعُ زَرْعًا، فَيَأْكُلُ مِنْهُ طَيْرٌ أَوْ إِنْسَانٌ أَوْ بَهِيمَةٌ، إِلَّا كَانَ لَهُ بِهِ صَدَقَةٌ »(۲)

کوئی انسان جو درخت لگاتا ہے یا کھیتی کرتا ہے تو اس سے پرندے یا انسان یا جانور کھاتے ہیں تو وہ اس کے لیے صدقہ ہے۔

یہ صدقہ جاریہ ہی کی ایک صورت ہے جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے لگائے ہوئے درخت سے لوگ مستفید ہوتے ہیں۔

"حضرت سعید بن ابی بردۃ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: "کہ ہر مسلمان پر صدقہ ہے۔ آپ ﷺ سے پوچھا گیا اگر وہ صدقہ کو نہ پا سکے، آپ ﷺ نے فرمایا اپنے ہاتھوں سے کمائے اور اپنے آپ کو نفع پہنچائے اور صدقہ کرے۔ عرض کیا گیا اگر یہ بھی نہ کر سکے، فرمایا کسی مجبور اور پریشان آدمی کی مدد کرے، پوچھا یہ بھی نہ کر سکے، فرمایا نیکی کا حکم دے۔ عرض کی یہ بھی نہ ہو سکے تو فرمایا برائی سے باز رہے یہ بھی صدقہ ہے"۔(۳)

خیر خواہی کا جذبہ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری ہے جان ہے کوئی بندہ اُس وقت تک

---

(۱) صحیح مسلم حدیث نمبر: ۴۸۱۵۔۴۸۱۷، ۳/ ۱۶۷۵

(۲) صحیح بخاری، باب فضل الذرع والغرس اذا اکل منہ، حدیث نمبر: ۲۳۲۰، ۳/ ۱۰۳

(۳) صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۳۳۳، ۲/ ۶۹۹

ایمان دار نہیں بن سکتا جب تک اپنے بھائی کے لیے وہی بات پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے"۔ (۱)

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"یہ بات کسی شخص کے لیے حلال نہیں کہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ قطع تعلق کرے۔اس طرح کہ دونوں ملیں اور یہ ادھر منہ پھیر لے اور وہ ادھر منہ پھیر لے۔ سنو! ان دونوں میں اچھا وہ ہے جو سلام کرے"۔ (۲)

غیر مسلموں سے تعاون

انسانوں کی خدمت اور ان کی فلاح و بہبود کے کام میں غیر مسلم تنظیموں اور اداروں کے ساتھ تعاون میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، اس سلسلہ میں قرآن مجید نے یہ اصولی تعلیم دی ہے:

﴿وَتَعَاوَنُواْ عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلاَ تَعَاوَنُواْ عَلَى الاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُواْ اللّهَ اِنَّ اللّهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ﴾ (۳)

نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو۔ گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں کسی کے ساتھ تعاون نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ کی سزا بہت سخت ہے۔

ریاست سے تعاون

خدمت خلق کا سب سے بڑا ادارہ ریاست ہے۔ افراد اور تنظیمیں ہزار طاقت ور سہی لیکن ان کی طاقت بہر حال محدود ہوتی ہے۔ ان کو اتنے وسائل و ذرائع حاصل نہیں ہوتے کہ ہر پہلو سے معاشرے کی خدمت کر سکیں اور اس کی تمام مشکلات کو حل کر دیں۔ ریاست غیر معمولی وسائل و ذرائع کی مالک ہوتی ہے اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مختلف طریقے استعمال کر سکتی ہے۔ اس لیے ایک فلاحی ریاست کی یہ قانونی اور اخلاقی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے کہ پورے معاشرے کی تعمیر اس ڈھنگ سے کرے کہ کوئی بھی شخص ضروریات زندگی سے محروم نہ رہے اور اسے وہ تمام سہولتیں اور مواقع حاصل ہوں جو اس کی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ اگر ریاست اپنی ذمہ داری کو محسوس نہ کرے تو اس کا وجود بے معنی ہے لیکن ریاست اتنی بڑی ذمہ داری سے اسی وقت سبکدوش ہو سکتی ہے جبکہ افراد اس سے تعاون کریں۔ محض ریاست کی کوشش سے معاشرہ غربت، افلاس، جہالت، بے روزگاری جیسی مصیبتوں سے پاک نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر فرد میں معاشرہ کو پستی سے نکالنے اور اوپر اُٹھانے کا

---

(۱) صحیح بخاری، باب من الایمان ان یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ، حدیث نمبر: ۱۳

(۲) صحیح بخاری، باب من انتظر حتی تدفن، حدیث نمبر: ۶۰۷۷، ۸/ ۸۲۱

(۳) سورۃ المائدہ: ۲

جذبہ پایا جائے۔ ریاست اور افراد کے اشتراک و تعاون ہی سے خدمت خلق کا حق ادا ہو سکتا ہے، اس کے بغیر یہ کام ہمیشہ ادھورا اور ناقص ہی رہے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ تَرَكَ مَالًا فَلِوَرَثَتِهِ، وَمَنْ تَرَكَ كَلًّا فَإِلَيْنَا»(۱)

جس نے مال چھوڑا وہ اُس کے ورثاء کے لیے ہے اور جس نے قرض چھوڑا وہ ہم پر ہے۔

فلاح و بہبود کی طرف خصوصی توجہ

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

«إِنَّ لِلَّهِ عَزَّ وَجَلَّ خَلْقًا خَلَقَهُمْ لِحَوَائِجِ النَّاسِ يَفْزَعُ النَّاسُ إِلَيْهِمْ فِي حَوَائِجِهِمْ أُولَئِكَ الْآمِنُونَ مِنْ عَذَابِ اللهِ»(۲)

اللہ تعالیٰ کی کچھ مخلوق (بندے) ایسی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے پیدا کیا ہے، لوگ اپنی ضرورتوں کے وقت ان کے پاس گھبرا کر آتے ہیں (اور یہ ان کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں) یہ لوگ (قیامت کے دن) اللہ کے عذاب سے محفوظ رہیں گے۔

ایک دوسری حدیث اس طرح ہے: کثیر بن عبد اللہ بن عمرو بن عوف المزنی اپنے والد سے وہ اپنے والد (عمرو بن عوف) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں جنہیں اللہ نے لوگوں کی حاجتیں پوری کرنے کے لئے پیدا کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی قسم کھائی کہ انہیں دوزخ کی آگ کا عذاب نہیں دیں گے، پس جب قیامت کا دن ہو گا تو ان کے لیے نور کے ممبر رکھے جائیں گے جن پر بیٹھ کر وہ اللہ تعالیٰ سے گفتگو کریں گے جب کہ دوسرے لوگ حساب میں مبتلا ہوں گے"۔(۳)

احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاح و بہبود کے کاموں سے ایسے ہی ثواب ملتا ہے جیسے دوسری عبادات سے ثواب ملتا ہے اور دوزخ سے بھی ایسے ہی نجات ملتی ہے جیسے دوسری نیکیاں کر کے ہوتی ہے۔

مسلمانوں کو خوش کرنا

مومن صرف اپنی ذات کے گرد نہیں گھومتا بلکہ اپنے دوسرے بھائیوں کے دکھ درد میں بھی شریک ہو کر ان کے دکھ درد کا مداوا کرتا ہے، جو بات انہیں دکھ پہنچاتی ہے، اسے دور کرتا ہے، اس کا حل تلاش کرتا ہے، اس سے

---

(۱) صحیح مسلم، باب الصلاۃ علی من ترک دینا،، حدیث نمبر: ۴۱۶۱، ۳/ ۱۱۸

(۲) طبرانی، سلیمان بن احمد، معجم الکبیر، باب زید بن اسلم عن ابن عمر، مکتبہ ابن تیمیہ، بیروت، ۱۹۹۴ء، ۱۲/ ۳۵۷

(۳) بیہقی، احمد بن الحسین بن علی، شعب الایمان، حدیث نمبر: ۷۶۷۸، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۰ھ، ۳/ ۱۲۳

نجات کی راہیں نکالتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالی ایسے انسان سے خوش ہوتے ہیں جو اپنے مسلمان بھائی کا غم ہلکا کرتا ہے، اس کے دکھ بانٹتا ہے۔ بڑی نیکیوں میں سے ایک نیکی یہ بیان فرمائی کہ وہ بندہ بہت اچھا ہے جو کسی انسان کو خوش کرتا ہے، خاص طور پر ایسا انسان جو رنج و غم میں مبتلا ہو، کسی حادثے کا شکار ہو گیا اور کسی صدمے کی وجہ سے نڈھال رہا ہو، ایسے انسان کے پاس جانا، اس کا غم ہلکا کرنا اور اسے خوش کرنا نیکی کا کام ہے، اس مفہوم کی متعدد روایتیں ہیں، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے سوال کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

«أَيُّ الْأَعْمَالِ أَفْضَلُ؟ قَالَ:أَنْ تُدْخِلَ عَلَى أَخِيكَ الْمُسْلِمِ سُرُورًا أَوْ تَقْضِي عَنْهُ دَيْنًا، أَوْ تُطْعِمَهُ خُبْزًا»(۱)

کون سا عمل سب سے زیادہ فضیلت والا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اپنے مسلمان بھائی کو خوش کر دیا اس کا قرض ادا کر دیا اسے کھانا کھلاؤ۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو کام اور باتیں مغفرت لازم کرنے والی ہیں ان میں سے ایک اپنے مسلمان بھائی کو خوش کرنا ہے یعنی اس کی بھوک دور کرنا اور اس کی پریشانی (تکلیف) دور کرنا ہے"۔

ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا

دین اسلام کی خصوصیات اور امتیازات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے پیروکاروں کی ایسی تربیت کرتا ہے کہ ان کا ظاہر و باطن، داخل اور خارج اور زبان و دل ایک ہو، اس میں دوئی اور دورنگی نہ ہو، جو بات دل میں سوچے وہی زبان پر آئے، اگر کسی شخص کا دل اور زبان ایک نہیں ہے تو اسلام اس کو نفاق اور منافقت کہتا ہے اور اسے دھوکے (خدع) کا نام دیتا ہے، حضرت تمیم بن اوس الداری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«الدِّينُ النَّصِيحَةُ قُلْنَا: لِمَنْ؟ قَالَ:لِلَّهِ وَلِكِتَابِهِ وَلِرَسُولِهِ وَلِأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِينَ وَعَامَّتِهِمْ»(۲)

دین سراپا خیر خواہی ہے، صحابہ کہتے ہیں کہ ہم نے پوچھا: کس کے لیے خیر خواہی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے لئے، اللہ کی کتاب (قرآن مجید) کے لیے، مسلمانوں کے سربراہوں اور ان کے عام لوگوں کے لیے خیر خواہی کرنا۔

(۱) شعب الایمان، باب التعاون علی البر والتقویٰ، حدیث نمبر: ۷۲۷۳، ۱۰/۱۳۰

(۲) صحیح مسلم، باب بیان ان الدین النصیحۃ، حدیث نمبر: ۵۵، ۱/۷۴

متن میں لفظ "النصیحة" آیا ہے جس کا مادہ نصح ہے، یہ کلمہ قرآن مجید میں مختلف شکلوں میں تیرہ مرتبہ آیا ہے، اور احادیث میں بہت سے مقامات پر آیا ہے، عربی میں یہ کلمہ اپنے معنی میں بڑی وسعت رکھتا ہے، ابن دقیق العید رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

"کلام عرب میں ایسا کوئی کلمہ نہیں ہے جو اس کلمے کے معنی واضح کر سکے، اور اپنے اندر سمو سکے"۔

مدینہ منورہ میں اسلام قبول کرنے کے بارے میں بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بیان کیا کہ ہم جب آپ ﷺ کی خدمت میں اسلام قبول کرنے آئے تو آپ نے بیعت کرتے وقت عہد لیا، حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ:

«بَايَعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ ، فَاشْتَرَطَ عَلَيَّ:وَالنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ»[1]

میں نے نبی ﷺ سے ہر مسلم کے ساتھ خیر خواہی کرنے پر بیعت کی۔

اسلام کی مجموعی تعلیم اور رسول اللہ ﷺ اور سیرت اور آپ کے ارشادات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایک مسلمان کو اپنی اصلاح کے لیے جہاں ذاتی نیکیاں، عبادتیں اور ریاضتیں کرنی چاہئیں وہاں اپنے ابنائے جنس (انسانوں) کی دینی و دنیاوی فلاح و بہبود کیلئے بھی کام کرنے چاہئیں۔ جس طرح معروف عبادات سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے اسی طرح اس کی رضا کی نیت سے اللہ کے بندوں کی فلاح و بہبود سے بھی حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح عبادات و اطاعت سے مومن جنت کا حق دار بنتا ہے اسی طرح اللہ کی مخلوق کی فلاح و بہبود سے بھی وہ جنت کا حق دار ہوتا ہے۔ اخروی نجات کے لئے حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کی ادائیگی بھی ضروری ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے دین اسلام کو تمام انسانیت کے لئے خیر خواہی قرار دیا ہے۔

❁ ❁ ❁

(۱) صحیح بخاری، باب مایجوز من الشروط فی الاسلام والاحکام، حدیث نمبر: ۲۷۱۴، ۲/ ۲۶۳

العدالة الاجتماعية في ضوء السيرة النبوية

Social Justices in the Light of Prophetic Sīrah

عبد الوهاب جان*

ABSTRACT

The study aimed at exploring social justice, peace, prosperity, love, welfare and coexistence in the light of Prophetic Sīrah being the model of humanism in the world. The Prophet Muhammad (ﷺ) was a paragon of social justice and a role model at the apex for humanity. He was a great social reformer and social activist. He (ﷺ) crippled an arrogant class and race-based system by the virtue of equality, avoiding the exploitation of basic rights of poor and by establishing a society based on virtues of charity and well-wishing. The Holy Prophet (ﷺ) strived for making a society based on collective and individual justice. He was real role model of tolerance and kindness which can vividly be observed at various events such as; entering the city of Makkah, the pact of Ḥudaybiya, the treaties with the non-Muslims, at the time of migration to Madīnah, fixing the Black-Stone and Ḥilf al-Fuḍūl. Thus, it is a fact that Holy Prophet (ﷺ) emerged a society that strives for gaining social justice. The researcher applied descriptive method for conducting this research. The study concludes the aspects of social justice in the Sīrah of the last Prophet which can surly enlighten the whole humanity and all societies of the world.

Key words: *Social justice, Prophet Muhammad (ﷺ), Sīrah, Rights*

* أستاذ مساعد،كلية أصول الدين،الجامعة الإسلامية العالمية،إسلام آباد

توطئة:

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على النبي الأمين، وعلى آله وأصحابه أجمعين. وبعد!

الإسلام دين العدالة الاجتماعية والفردية، وأن الرسول ﷺ هو نبي العدالة وناصر المظلوم وراعي الأيتام والأرامل ومساعد المستضعفين ومحرر العبيد، وإغاثة المنكوب وتحسين مستواه، وإن جميع مواقف النبي ﷺ قبل النبوة وبعدها سجلّ حافل بالعدالة الاجتماعية، وخير مثال على ذلك معاهدة حلف الفضول، وبناء الكعبة المشرفة، ووضع الحجر الأسود، ورفع مستوي المرأة في المجتمع، وإعطاؤها الحقوق في التملك والتصرف، والحرية، وفي ممارسة الأعمال الدينية والدنيوية، كما أن حياته مليئة بالحفاظ على العدالة الاجتماعية في السفر والحضر وصلة الأرحام واحترام الجيران والكف عن المحارم والدماء والأعراض، وهذه المعاهدات والمواثيق أبرمت لأجل تحقيق العدالة الاجتماعية أمثال بيعة العقبة الثانية، وميثاق المدينة، وصلح الحديبية، والمعاهدة مع أهل نجران وما إلى ذلك من رعاية شئون العباد والبلاد، كل ذلك خير دليل على أن الرسول ﷺ كان في خدمة الناس وتحقيق العدالة الاجتماعية قولاً وعملاً عقيدةً وسلوكاً، وحياته ﷺ مملوءة بتلك المواقف التي تضاف إلى سجل العدالة الاجتماعية سواء قبل الإسلام أوبعده، كما ذكرت السيرة النبوية الشريفة، وسوف يقوم الباحث بتناول بعض الوقائع من السيرة النبوية الشريفة التي يظهر فيها العدل الاجتماعي في الإسلام.

العدالة الاجتماعية في المجتمع الجاهلي وبعثة الرسول ﷺ

نستطيع القول بأن العدالة الاجتماعية قد ازعجت المجتمع الجاهلي الأول، فبعد ترسيخ عقيدة التوحيد الخالص، إن الرسول ﷺ لم يكتف بدعوته بل أنه دعا إلى تحريم الربا والخمر والزنا والميسر، وقريش لا تستغني عن هذه الأربعة، ففيها متعتهم وتفاخرهم، وفيها غناهم وثروتهم، والنبي عليه السلام يرى منع ذلك؛ لأنه تعدى الطيبات، ومصادر الثروة ما بنيت على استغلال الفرص واستغلال حوائج الناس، فيعرض الفقراء لمزيد من المظالم[١].

فالرسول ﷺ لم يكتف بالتوحيد والبعث، وتحريم بعض ما طاب لنفوس القوم، بل دعا كذلك إلى أمر مفقود عندهم وهو حق المساواة، وهم الذين تربوا سنين على التفاخر والتعالي وإظهار الأنساب والتفاخر بها، فكان النبي ﷺ يرى في ذلك ضياعا لمفهوم العدالة الاجتماعية، وإن مساواته بين السادة

(١) مجموعة من العلماء بإشراف صالح بن عبد الله بن حميد،نضرة النعيم في مكارم أخلاق الرسول الكريم،دار الوسيلة للنشر والتوزيع،جدة،السعودية،الطبعة السابعة: ٢٠١٠م،١/٢٢٢

والعبيد أثارت القوم أيما إثارة، بل أنه نادى بأن الناس جميعا سواسية كأسنان المشط، وهذا ما جعلهم يثيرون عليه ثورة عارمة أظهروا فيها تصرفاتهم الجاهلية الحمقاء[١].

وقد كان النبي ﷺ -بالرغم من كونه من أسياد قريش حسبا ونسبا- إلا أنه طبّق مفهوم العدالة الاجتماعية، وذلك حين فتح بيته واستقبل الفقراء والبسطاء والعبيد، أولئك المستضعفين الذين لا يجدون من يحميهم ويدافع عنهم ويطالب بحقوقهم ويحفظ إنسانيتهم.

ولقد كان من بواكير من أسلموا "زيد بن حارثة" وهو مولى مملوك من العبيد، ضلّ أهله واقترب من الرسول ﷺ، ولما عثر عليه أهله خيره الرسول ﷺ ما بين العودة إلى أسرته أميرا معززا أم يعيش مع النبي ﷺ، فاختار النبي ﷺ [٢].

وعرفت قريش الذين أسلموا، وكان منهم فقراء وبسطاء، فطلب القرشيون برؤيتهم السيادية وعيونهم المتعالية أن يمنع هؤلاء من الحضور إذا أراد النبي ﷺ في مؤخرة الصفوف وآخر المجلس، وكان النبي ﷺ يبحث في طلبهم هذا، فنزل قوله تعالى: ﴿واصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ والْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وجْهَهُ ولَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ولَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا واتَّبَعَ هَواهُ وكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا﴾[٣].[٤]

ولقد نزل القرآن المكي يتعهد ذكر الأمم السابقة الهالكة وهي أمم تتشابه أفعالها تماما مع مشركي مكة، وفي هذه القصص تصريحات بضرورة ترسيخ مفهوم العدالة الاجتماعية. أما في المجتمع الجاهلي فإن هناك آيات نزلت توضح أن الإنسان ذكرا كان أو أنثى في الثواب والعقاب واحد، وأن للأنثى أن تنصح الرجل كما للرجل أيضا، وليست هناك عبادات لهذا أو ذاك، بل هم جميعاً في ذلك مشتركون، قال تعالى: ﴿والْمُؤْمِنُونَ والْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَولِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ ويَنْهَونَ عَنِ الْمُنْكَرِ ويُقِيمُونَ الصَّلَاةَ ويُؤْتُونَ الزَّكَاةَ ويُطِيعُونَ اللَّهَ ورَسُولَهُ أُولَئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾[٥] فهذا من قبيل غرس المفهوم الجديد بين الرجل والمرأة بعد ما كان للرجل السيادة المطلقة بلا ضوابط[٦].

---

(١) نضرة النعيم،٢٢٢/١

(٢) قلعجي،د.محمد،دراسة تحليلية لشخصية الرسول،دمشق،١٩٨٨،ص: ١٩١

(٣) سورة الكهف،الآية: ٢٨

(٤) الصلابي،د.علي محمد،السيرة النبوية عرض وقائع وتحليل أحداث،دار التوزيع والنشر الإسلامية،مصر،٢٠٠١، ١١٨/١

(٥) سورة التوبة،الآية: ٧١

(٦) السيرة النبوية للصلابي،١٤٠/١

التطبيق العملي للعدالة الاجتماعية، المرأة نموذجاً

عرف المجتمع السابق للإسلام –في كل بقاع الدنيا– بأنه مجتمع لم تكرم فيه الأنوثة في شيء، ولم تحترم رغبتها ولا آراميتها، وبلغت أنها كانت تقتل طفلة، أو يجبرها أبوها على البغاء مقابل الإتيان بالمال اللازم وليس لها حق في أموال ولا ميراث وتزوج بغير إذنها ولا كرامة[١].

وهذه الأوضاع أشارت إليها آيات القرآن الكريم، فقد نهى الدين عن وأد البنات، قال تعالى: ﴿وإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثَى ظَلَّ وجْهُهُ مُسْودًّا وهُو كَظِيمٌ يَتَوارَى مِنَ الْقَومِ مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ أَيُمْسِكُهُ عَلَى هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ﴾[٢]، ويسجّل القرآن الكريم الحالة بنفسها فيقول: ﴿ولَا تَقْتُلُوا أَولَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ...الخ﴾[٣].

ومكانة المرأة الدونية لم تكن في الأمة العربية فحسب، بل كانت في حضارات أخرى مثل حضارتي الفرس والروم وغيرهما[٤]. وكذلك كانت بعض الأسر تجبر الفتاة على البغاء وهي ترفض وتريد أن تعيش طاهرة نقية، وكان الأب يحصد الأموال من وراء ذلك، قال تعالى: ﴿ولَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِتَبْتَغُوا عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾[٥]، كما كانت الأسر المحترمة ترتكب جريمة أخرى وهي إجبار البنت على الزواج ممن لا تريد، وقد حذر الرسول ﷺ من ذلك: «البنت تُستأذن وإذنها صمتها، والثيب تستأمر»[٦].

وهذا الكلام تناوله العديد من الأساتذة والعلماء، لكن الذي نريده الآن إلقاء الضوء على النتائج... فقد نتج عن ذلك تأخر واندحار في مفهوم العدالة الاجتماعية! وهل العدالة تستلزم أن تهدر قيمة المرأة ويكون للحيوان قيمة عنها؟ أما الرسول ﷺ فقد وجد هذا الحال على ما هو عليه، وهو أمر لا تفخر به أية حضارة فضلا عن المجتمعات الإنسانية المتنوعة.

فقد تزوّج من السيدة خديجة رضي الله عنها بعد أن عمل في تجارتها، وكأنه بذلك يرسخ مفهوم العدالة الاجتماعية، فلا ينكر عليها زواجها قبله من رجلين ماتا. وترك أولادهما ليربيهم النبي الكريم ﷺ، وكأنه

---

(١) الخولي،د.البهي،الإسلام وقضايا المرأة المعاصرة،الإتحاد الإسلامي العالمي للمنظمات الطلابية،الكويت، ١٩٨٠،ص: ٣٠-٣٧

(٢) سورة النحل،الآية: ٥٩

(٣) سورة الإسراء،الآية: ٣١

(٤) راجع: الإسلام وقضايا المرأة،ص: ١٢-١٦

(٥) سورة النور،الآية: ٣٣

(٦) القشيري،مسلم بن الحجاج،المسند الصحيح،كتاب النكاح،باب استئذان الثيب في النكاح،رقم الحديث: ١٤١٩،تحقيق: محمد فؤاد عبدالباقي،دار إحياء التراث العربي،بيروت

يريد أن يؤكد أن الأرملة لها حقوق إنسانية، منها أن يفتح الإسلام لها باب الحياة من جديد[١].

وترسخ مبدأ لم يعهده الناس قبل، وهو أن السيدة خديجة ﵂ قد طلبته للزواج وهي سابقة لم تعهد بكثرة على مسامع الناس، وفي ذلك أيضا إحياء للعدالة الاجتماعية، فكم تجبر الأسر البنات على الزواج ولا ترى لتصرفها في نفسها حقوقا[٢].

والرؤية التطبيقية هنا تؤكّد أن النبي ﷺ لم يمارس رجولة زائفة على السيدة خديجة ﵂ بإطلاق الأوامر، وإنما منحها الحرية المطلقة في ممارسة تجارتها، وهي ارتكنت إلى أمانته، وكان لصعود قيمة المرأة إضاءة على أنها إنسان له حق الحياة ومستلزماتها، قال تعالى: ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾[٣].

وضرب النبي ﷺ مثلا للإخلاص لهذه المرأة الوفية (السيدة خديجة ﵂) ولم يتزوج عليها حتى وفاتها، وفي حياة الرسول الكريم قويت السيدة خديجة ﵂ حتى بلغ تأثيرها أن خافها المجتمع المكي، واعتبرها سندا للنبي ﷺ يعمل له ألف حساب، ولما ماتت في عام الحزن الذي مات فيه عمه أبوطالب قال المشركون: "لقد ماتا سندا مُحَمَّد"[٤].

ويرتفع شأن المرأة في نموذج حياة النبي ﷺ مع السيدة خديجة ﵂ حين تمارس الدعوة وحمايتها والدفاع عنها، فهي تملك إيمانا فطريا زكيا، فتقف بجوار النبي ﷺ حين يتلقى الوحي لأول مرة، وتثبته وتذهب به إلى ابن عمها ورقة بن نوفل لتحكي له عن الناموس الأكبر (الوحي) الذي نزل على النبي ﷺ[٥]، وأن خميرة العدالة الاجتماعية التي في قلب النبي ﷺ وفطرته منحت هذه المرأة القوة فأظهرت مواهبها في صيانة هذا الدين.

وهو أمر يدعو المسلمين إلى أن يتربصوا بأحوال البنات، فيعطونهن حق التعليم إلى أعلى الدرجات فما ترتفع أمة إلا بالأخلاق والتعليم، وما تنحدر إلا بإهدار قيمة تعليم المرأة، وفي الحديث النبوي الشريف: «طلب العلم فريضة على كل مسلم» (وفي رواية أخرى) «ومسلمة»[٦].

---

(١) خالد فؤاد،د.مُحَمَّد،السيرة النبوية،أضواء وإشراقات،القاهرة،٢٠٠٥،ص: ٤١

(٢) السيرة النبوية،خالد فؤاد،ص: ٤٣

(٣) سورة البقرة،الآية: ٢٢٨

(٤) أبوشهبة،السيرة النبوية في ضوء القرآن والسنة،دارالقلم،دمشق،الطبعة الثالثة: ١٩٩٦،١/٢٢٤،وحسين هيكل، د.مُحَمَّد،في منزل الوحي،دارالمعارف،القاهرة،١٩٧١م،ص: ٧٨

(٥) راجع للتفصيل: المقريزي،إمتاع الأسماع،بيروت،١٩٨٠،ص: ٢٨

(٦) القزويني،مُحَمَّد بن يزيد،صحيح سنن ابن ماجه،تحقيق: مُحَمَّد فؤاد عبد الباقي،دار إحياء الكتب العربية،١/٤٤

إن مفهوم العدالة الاجتماعية رفع من شأن السيدة خديجة ﵂ كزوجة لآخر الأنبياء والمرسلين، وزوجات الدعاة وأصحاب الهمم يحتاجون إلى هذا النموذج المتكامل من النساء[١]. ضاحية وأنها أوّل من أسلم من الناس قبل أي أحد من الرجال، وأول من استمع إلى الوحي الإلهي من فم النبي ﷺ، وأوّل من تعلم الصلاة من الرسول الكريم[٢].

وكذلك كانت رعاية النبي ﷺ لبناته وحبه لهن فإنه كان انعكاسا للفطرة السليمة التي تحلّى بها الرسول ﷺ قبل الإسلام، وهو في مجتمع جاهلي كم أنكر عليه النبي الكريم ﷺ[٣].

تطبيق العدالة الاجتماعية في العبيد وتحريره

هذا فضلا عن سياسة تحرير العبيد، فالعبيد فئة مستضعفة، يملكها السيد المالك فيفعل بهم ما يشاء، ويخدمونه عنده وله حق تأديبهم بكل الوسائل، ولقد عاشوا حياة ذلّ، ولما جاء الإسلام كان عددا فيهم في طليعة المسلمين ولم يكن من العدالة الاجتماعية تركهم لمن يعذبهم وينكل بهم، فجاء أبوبكر الصديق ﵁ وكان يحرر منهم الكثير ويدفع ثمنهم، ثم يحررهم ويعطيهم حريتهم، ومن هذه الأمثلة نموذج بلال بن رباح ﵁، حيث كان سيده أمية بن خلف يعذّبه وينكل به، واشتد ذلك عندما أسلم فكان يعذّبه ويجرّه في الصحراء، ويضع عليه الحجر فوق بطنه، ويجبره على الإسلام ويقول أحد أحد، وعلم سيدنا أبوبكر ﵁ فاشتراه من أمية بن خلف، ثم أطلق سراحه ومنحه الحرية[٤]. ولم يحرر أبا بكر حسب، بل حرر أيضا مثله عامر بن فهيرة، أم عبيس، والنهدية وبنتها وغيرهم من العبيد، وقد شاركه في ذلك عثمان بن عفان ﵁، وكل مسلم قادر كان عنده عبد قام بتحريره، وقد ضرب المسلمون مثلا رائعا بتطبيق العدالة الاجتماعية حيث أن العبيد في الأصل من بني آدم ﷺ، وقد وضع الإسلام كفارّة الذنوب أن يحرر المسلم عبدا يعتق رقبة[٥].

حلف الفضول ودور النبي ﷺ في تحقيق العدالة الاجتماعية

بعد الانتهاء من حرب الفجار عاد الحلفاء إلى مكة ببضاعة كانت في حوزة رجلاً من مدينة زبيد

(١) الحميدي،عبد العزيز،التاريخ الإسلامي مواقف وعبر،دار الدعوة،الإسكندرية،مصر،١٩٩٧م،٦٨/١

(٢) كركر،د.عصمة الدين،المرأة في العهد النبوي،الغرب العربي،بيروت،١٩٩٣،ص: ٣٦

(٣) د.عائشة عبد الرحمن،معاملة النبي لزوجاته وبناته،سيدات بيت النبوة،دارالمعارف،١٩٩٢م،ص: ١٨

(٤) انظر:خالد فؤاد،د.مُحَمَّد،رجال حول الرسول،بيروت،١٩٨٠م،ص: ٨٥

(٥) وافي،علي عبد الواحد،تحرير العبيد،مقال،مجلة الأزهر،١٩٦٦م،ص: ١١٨

(بلد في اليمن)[١]، وجاء العاص بن وائل[٢] ليشتريها من هذا الرجل ومنعه حقه، فاستعدى الزبيدي أشراف مكة على "العاص بن وائل" ونادى على آل فهر[٣] وأهل المروءة، فاجتمعت القبائل في دار عبد الله بن جدعان، وتحالفوا في شهر الله الحرام (ذوالقعدة) فتعاقدوا وتحالفوا بالله ليكونوا يدا واحدة مع المظلوم على الظالم، حتى يُردَّ إليه ما بلَّ بحرٌ صوفة[٤]، وما بقي جبلا ثبيرا وحراء مكانهما (وذلك كناية عن التأبيد والاستمرار إلى النهاية، كما أن ماء البحر لا ينقطع...)[٥]، وهذه القبائل انتزعوا سلعة الزبيدي من العاص بن وائل فدفعوها إليه، وأطلقت قريش على هذا التحالف الذي ينصح بالعدالة (حلف الفضول)، وقالوا: إن هؤلاء دخلوا في فضل الأمر، وقد حضر النبي مُحَمَّد ﷺ هذا الحلف الذي أبرز فيه العرب حبهم للعدالة، وقال فيه ﷺ: «لقد شهدت في دار عبد الله بن جدعان حلفا ما أحب أن لي به حمر النعم، ولو دعيت به في الإسلام لأجبت»[٦].

وهنا تبدوا ملامح العدالة الاجتماعية واحترام العدل وتقديره بشكل مطلق، والعدالة الاجتماعية لقيت احترام الرسول ﷺ مهما كانت حتى وإن كانت من دولة لا تدين بالإسلام.

كما تظهر من الواقعة أن حلف الفضول بمثابة ومضة لها بريق في ظلام الجاهلية، وإن كان في سنن التاريخ ما يؤدي إلى هلاك الأمم متى انتشر الشر فيها، فإن أي مجتمع –وفق سنن التاريخ– لا يخلو من فضيلة، فإن المجتمع الجاهلي برغم تفشي الربا والبطش، والزنا واستغلال العبيد، فإنه لم يخل من فروسية وشهامة ونجدة المستغيث ونصرة المظلوم[٧].

كما يظهر أن الظلم حرام، وأنه مرفوض بأي صورة حتى ولو كان في هيئة الخوض في حق شخص ما، وعندما جاء الإسلام حارب الظلم وطالب بالوقوف بجانب المظلوم، دون النظر إلى لونه ودينه، ووطنه وجنسه.[٨]

ومن فهم السيرة من خلال الأحداث النص النبوي هذا له تبين أنه من الجائز شرعا التحالف

---

(١) انظر: الحموي،ياقوت بن عبد الله،معجم البلدان،دار صادر،بيروت،الطبعة الثانية: ١٩٩٥م،حرف الزاي

(٢) سيد بني سهم في قريش يلتقي نسبه مع النبي مُحَمَّد ﷺ في كعب بن لؤي.

(٣) قبيلة آل فهر هم ابناء مفلح بن عياش بن شداد المغيري،عبدالرحمن،المنتخب في ذكر نسب قبائل العرب،شركة التراث البرمجيات،٢٠١٥م،١/٤٨

(٤) الإفريقى،ابن منظور،لسان العرب،دارصادر،بيروت،الطبعة الثالثة: ١٤١٤هـ،حرف الصاد،صوف،رقم الجزء: ٨

(٥) أبوشهبة،د.مُحَمَّد،السيرة النبوية في ضوء القرآن والسنة،١/٢١٣

(٦) ابن هشام،السيرة النبوية،جدة،١٢٢٨هـ،١/١٢٤

(٧) راجع: نير الغضبان،فقه السيرة النبوية،بيروت،١٩٨٧،ص: ١١٠

(٨) أبوفارس،السيرة النبوية،دمشق،١٩٩٢م،ص: ١٢١

على فعل الخير مع دول غير مسلمة تتفق على تحقيق العدالة الاجتماعية، وفي الفقه السياسي للإسلام: "إنه يجوز التعاون مع غير المسلمين في الأمور المشروعة التي يتقدم فيها الإسلام وأهله، وأما ما كان فيه إضرار بالمسلمين أو تأخر حالهم أوتعيق تقدمهم فهذا لا يجوز شرعا"(١).

وهذا النموذج الذي يطرح من فوائده ترسيخ العدالة الاجتماعية هو من بواكير مواقف النبي ﷺ في السيرة الشريفة.

بناء الكعبة الشريفة وفيه العدالة الاجتماعية

هذا الحادث كان في الجاهلية أيضا، فإن إبراهيم عليه السلام قد بنى الكعبة بحجارة منضودة بعضها على بعض من غير طين يحكم بناؤها، ولما جاءت السيول تتوالى عبر السنين أصابتها حتى ارتأى رجال القبائل أن يهدموها، ثم يشيدها على إحكام وتثبيت، وعندما جاء وقت البناء والتشييد، اجتمع سادات وكبراء القبائل حيث اختصت كل قبيلة بعمل جزء من الكعبة كشرف يحوزنه طوال التاريخ، وشارك النبي ﷺ في بناء الكعبة هو وعمه، وجاء وقت وضع الحجر الأسود في موضعه فأرادت كل قبيلة الفوز بهذا الشرف وتنازعوا وتفاخروا بالماضي والأنساب وعلو القمة وكادوا يقتتلون!! فاقترح عليهم أبو أمية بن المغيرة أن يحتكموا لأول من يدخل عليهم من باب المسجد الحرام، وأراد جلّ شأنه أن يكون النبي الكريم ﷺ، فقالوا عندما رأوه: هذا هو"الأمين" رضينا بحكمه، فقال ﷺ : «هلمّوا ثوبا» أحضروا له ثوبا فوضع بيده الحجر على الثوب وقال: لتأخذ كل قبيلة بناحية من الثوب، ثم ارفعوه جميعا، ففعلوا حتى جاؤوا الركن فوضعه عليه السلام بيده الشريفة(٢).

هذه الواقعة يستدل بها المؤرخون وكتّاب السيرة على سلوك النبي ﷺ في جمع كلمة المتفارقين والألداء، وهذا صحيح لا مراء فيه، لكن من جهة أخرى نرى أن سبب النزاع أصلا يعود إلى تعالي بعض القبائل على الأخرى بالقهر وادعاء الشرف! واستمرار ذلك السلوك يهدر قيمة العدالة الاجتماعية ويقتلها من الجذور، الأمر الذي يتنافى مع فطرة الرسول النقية وإيمانه المطلق بفكرة العدالة الاجتماعية فهو -وإن كان منع خلافا سياسيا كبيرا- إلا أنه لم ير علوا لأحد على الآخر، وهذا في أصله مركز العدالة الاجتماعية، فحين تمنح السياسة وعلو الشخص في الإدارة فإن ذلك لا يمنحه السيادة، ولذلك كانت فطرة النبي ﷺ مع ترسيخ مبدء السواسية بين الكبراء والأسياد، وهذا ما بلغه الرسول ﷺ بعد نزول

---

(١) أبوزهرة، محمّد، العلاقات الدولية في الإسلام، دارالفكر العربي، ١٩٨٥م، ص:١٨

(٢) المطلبي، محمّد بن إسحاق بن يسار، سيرة ابن إسحاق، تحقيق: سهيل زكار، دارالفكر، بيروت، الطبعة الأولى: ١٩٧٨م، ١٩٨/١

الوحي حين قال: «... لا فضل لعربي على أعجمي...» [١].

إن التفاخر كان سمة معروفة بين القبائل في العهد الجاهلي، وكانت المشكلة مع هؤلاء تستلزم إصلاح عقيدة، وإزالة عادات تحرمها الإنسانية، أو قبول عبادات أو إصلاح مجتمع من المجتمعات "هذا من أصعب مهام الأنبياء والرسل"... والقضية الآن هي: إزالة أنقاض الجاهلية، ووثنية تخريبية تراكمت عبر القرون والأجيال ودفنت تحتها تعاليم الأنبياء والمرسلين... فكان لا بد من إحياء النفوس وبيان سموّ الإنسان وإحيائه من موات الجاهلية الأولى[٢]. وكان حتما مقضيا أن يتغير المجتمع بعد ما مات عبر توارث العادات التي أفرزت الظالمين[٣]. قال تعالى: ﴿أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمَاتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا كَذَلِكَ زُيِّنَ لِلْكَافِرِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾[٤].

الهجرة إلى الحبشة

لقد رأى النبي ﷺ أن القلة التي آمنت تتعرض للإيذاء وربما إذا هلكت هلك الإسلام معهم، فلم يؤمن غيرهم، فنصحهم بضرورة الفرار بالدين عبر الهجرة إلى الحبشة وذلك في السنة الخامسة من البعثة[٥]. وقد اتهم البعض النبي ﷺ بأنه من هاجرهم الفقراء الذين أسلموا ولم يجدوا في الإسلام عملا يتكسبون منه، فأراد مُحَمَّد ﷺ أن يمنحهم فرصة عمل يتكسبون منه في بلد غير مكة[٦]. وهذا مما يؤسف له من تفكير ضعيف جدّا، فإن من هؤلاء المهاجرين عثمان بن عفان ﷺ أغنى أغنياء قريش وكبير تجارها، هاجر ومعه زوجته رقية بنت النبي ﷺ وعدد النساء... وهذه هي الهجرة الأولى للحبشة[٧].

وقد يسأل سائل: ما علاقة الهجرة إلى الحبشة بالعدالة الاجتماعية؟

إن النبي ﷺ قد جمع في هذه الهجرة الأغنياء والبسطاء معا من رجال ونساء، من بني هاشم وبني أمية على السواء، وكذلك أفراد من قبائل أخرى ذابوا جميعاً في بوتقة الإسلام ولم يشعروا بالفروق الاجتماعية، بل كان في هذه الهجرة محنة ملحوظة اشترك فيها الجميع وتحملها الأغنياء والفقراء معا، وهذا الفرق يظهر في منهج النبي الأعظم ﷺ فهو أوّل من تحمل الأذى حتى لا يقول أحد أنه عرض المسلمين

---

(١) السيرة النبوية،ص:٢٨- ٣٩

(٢) الندوي،أبو الحسن،السيرة النبوية،دارغفاري،الأردن، ١٩٨٠م،ص: ٥٨،٥٩

(٣) السيرة النبوية للندوي،ص: ٥٩

(٤) سورة الأنعام،الآية:١٢٢

(٥) ابن سعد،الطبقات الكبرى،دارالكتب،مصر، ١٩٨٠م،١/٢٠٤

(٦) وات،مونتجمري،مُحَمَّد في مكة،ترجمة: قدري قلعجيي،دارصادر،بيروت، ١٩٨٠م،ص: ٤٨

(٧) العسقلاني،ابن حجر،فتح الباري بشرح صحيح البخاري،دارالكتب،المصرية، ١٩٧٠م،٧/٢٢٨

للمحنة وإنما هو كان بعيدا عنها؛ لأن نسبه عال ولا يضارعه أحد في هذا النسب، وهكذا تبدو ملامح العدالة الاجتماعية جلية.

أما الفكرة فإن القرآن قد نزل مشيرا إلى ذلك دون تحديد وجهة معينة يقول الله تعالى: ﴿لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ وَأَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةٌ إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾[١]، ومن هنا اختار النبي ﷺ الحبشة لتكون الموطن المؤقت للإسلام، ونلاحظ أن النبي ﷺ قد اختار بلد (الحبشة)؛ لأن ملكها يتصف بالعدالة الاجتماعية، وقد سمع عنه رسول الله ﷺ وقال فيها: «اذهبوا إلى أرض الحبشة فإن فيها ملكا لا يظلم عنده أحد»[٢]. وكان هذا الملك على دين النصرانية، وكانت فرصة مواتية لنشر الإسلام خارج مكة في بلد يحمل دينا سماويا، ولعل عرض المسلمين لجوانب الاتفاق بين النصرانية والإسلام يفتح مجالا لدخولهم في الإسلام[٣].

بلغت معلومات خاطئة إلى المسلمين في الحبشة فرجعوا إلى مكة، ولما عادوا رأوا تعذيبا أشد وتنكيلا أقوى... وقام المسلمون بالهجرة الثانية إلى الحبشة، ولكن هذه المرة يعقبهم القريش وبلغوا النجاشي وخاطبوه بشأنهم وأخبروه أنهم هاربون من بلادهم وخرجوا عليهم، وفارقوا دين الآباء، ولم يدخلوا في دينكم (النصرانية)، فاستفردوا بالرهبان والبطارقة النصارى ليقنعونهم، ولما بلغ الأمر النجاشي حكوا له وأخبروه أن هؤلاء المسلمين مبتدعون، جاؤوا بدين جديد، لكن النجاشي غضب جداً، وتعهد ألا يسلمهم، لأنه أعطاهم الأمان، ثم أوهموه أنهم يكرهون المسيحية ويقولون في حق مريم كلاما لا يليق بها، فطلبهم النجاشي وحاورهم فتكلم معه جعفر بن أبي طالب ردّاً على الأسئلة التي وجهها النجاشي له، فقال ﷺ: «يا أيها الملك! كنا قوما أهل جاهلية، نعبد الأصنام، ونأكل الميتة، ونأتي الفواحش، ونقطع الأرحام، ونسيء الجوار، ويأكل القوي منا الضعيف، فكنا على ذلك حتى بعث الله إلينا رسولا منا، نعرف نسبه وصدقه وأمانته وعفافه، فدعانا إلى الله لنوحده ونعبده، ونخلع ما كنا نعبد نحن وآباؤنا من دونه من الحجارة والأوثان، وأمرنا بصدق الحديث وأداء الأمانة وصلة الرحم وحسن الجوار والكف عن المحارم والدماء، ونهانا عن الفواحش وقول الزور وأكل مال اليتيم وقذف المحصنات، وأمرنا أن نعبد الله وحده لا نشرك به شيئا، وأمرنا بالصلاة والزكاة والصيام».[٤]

ويبدوا من حوار جعفر بن أبي طالب ﷺ والنجاشي بعض الأمور جديرة بالأهمية تبيّن بعضا مفهوم العدالة الاجتماعية:

---

(١) سورة الزمر،الآية: ١٠

(٢) الطبري،مُحَمَّد بن جرير،تاريخ الأمم والملوك،بيروت،الطبعة الثانية: ١٩٨٥م،٣٢٨/٢

(٣) سيد قطب،في ظلال القرآن،دارالشرق،مصر،١٩٨٠م،٢٩/١،سليمان عودة،الهجرة الأولى في الإسلام،مكة، ١٣٣١هـ،ص: ٢٤

(٤) السيرة النبوية لابن هشام،٢٨٩/١،٢٩٣

١. أن القوي كان يأكل الضعيف، فنهى النبي ﷺ عن ذلك فأصبحوا سواسية وبنعمة الله إخوانا.
٢. قطع الأرحام حالة من التمزق الاجتماعي فأمر النبي ﷺ بإيصاله وقطع دابر الخصومات.
٣. إساءة الجوار نوع من الظلم الاجتماعي، نهى النبي ﷺ عنه وأوصى بالجار حتى ظن الناس أن النبي ﷺ سوف يدخله في الميراث.
٤. قول الزور نوع من الظلم الاجتماعي، يدخل البريء في دائرة الظلم الأسود، فنهى الله تعالى عنه وحذّر النبي ﷺ منه: «ألا وقول الزور، ألا وقول الزور، وما زال يكرره حتى قال من يجلسون حوله ليته سكت»(١).
٥. من أخطر القضايا الاجتماعية أكل مال اليتيم وهي صفة ما زال يرتكبها البعض إلى الآن، ونهى الإسلام عنها وفيه إحياء للعدالة الاجتماعية.
٦. عرفت الجاهلية سهولة النيل من الأعراض وقذف المحصنة، الأمر الذي يترتب عليه كسر القيم في المجتمع، وسهولة النيل من الأعراض، ومنع ذلك وتحريمه من شأنه غرس العدالة الاجتماعية حتى تشعر المرأة بالأمانة والسيرة الحسنة، فحماية المجتمع من الوالغين في الأعراض عدالة اجتماعية مستحقة.
٧. إن وجود ابن عم الرسول ﷺ، وصهره عثمان بن عفان ﷺ، وابنته رقية ﷺ جميعاً في مقدمة المهاجرين له دلالة عميقة تشير إلى أن الأخطار لابد، وأنه يتجشمها المقربون إلى القائد وأهله ورحمه، أما يكون القائد بعيدا عن الأخطار ثم يلقى فيها الأبعدون عنه، وغير ذي المكانة فهو منهج ليس من العدالة الاجتماعية، ولا يرتكبه رسول الله أبدا، لذلك كان هذا الفعل نوعا من العدالة الاجتماعية في الإسلام(٢).
٨. قد يكون في الوطن الواحد ديانتان، وقد يظلم أهل ديانة ديانة أخرى، وهذا من الظلم الاجتماعي، ولكن النبي ﷺ لم ير بأسا أن يأمر أتباعه بالذهاب إلى وطن ديانة أخرى يقيم حكامها العدالة الاجتماعية ويحترمون حقوق الإنسان.

---

(١) الترمذي،محمد بن عيسى،السنن،باب الشهادات،رقم الحديث:١٨٦،شركة مكتبة مصطفى البابي الحلبي،مصر، ١٩٧٥م

(٢) السيرة النبوية لابن هشام،٢٤٢/١

بيعة العقبة الثانية وما فيها من العدالة الاجتماعية

اقترب الوعد الحق، وأصبح الرسول ﷺ قريبا من الهجرة فقد جالس وفد يقرب مرتبته، والأولى كانت نواة للبيعة الثانية، وفيها جاء وفد كبير رفيع المستوى مكوّن من اثنين وسبعين فرداً جالسوا النبي ﷺ، وأرادوا أن يكون بينهم، فكانت البيعة التي أبرزت بعض القيم التي تحمل وجه العدالة الاجتماعية، قال ﷺ : «أبايعكم أن تمنعوني مما تمنعون منه نساءكم وأبناءكم، فأخذ البراء بن معرور ﷺ بيده، وقال: نعم والذي بعثك بالحق (ثم قال) فنحن والله أهل الحرب، وأهل الحلقة، فقاطعه أبو الهيثم بن التيهان مسائلا: يا رسول الله إن بيننا وبين الرجال (يقصد اليهود في المدينة) حبالا وإنا قاطعوها (يعني: سوف نتركهم لنكون معك) فهل عسيتم أن نحن فعلنا ذلك، ثم أظهرك الله أن ترجع إلى قومك (في مكة) وتدعنا؟ فتبسّم رسول الله ﷺ ثم قال: «بل الدم الدم، والهدم الهدم، وأنا منكم وأنتم مني، أحارب من حاربتم وأسالم من سالمتم»(١).

وفي التعمق في النص النبوي الشريف الذي بايع فيه الرسول ﷺ أهل المدينة نرى أنه ﷺ غرس فيهم صفة نجدة المظلوم، فأيما قوم رأوا بينهم رجلا يظلم ولم يردوا عنه الظلم إلا حشروا مع الظالم سواء بسواء، وأدركتهم لعنة الله، وفيه غرس معنى العدالة الاجتماعية والتي بها يحيا المظلوم أمنا؛ لأنه حتما سيجد من ينصفه ويعطيه حقه.

والرسول ﷺ حين يعاهد أهل المدينة على ذلك فهو يعطي آنذاك مقدمة للإسلام الرافض لمبادئ الظلم الاجتماعي ولا ننسى أهمية هذه المبايعة، لماذا؟ لأن المدينة بها عناصر متشابكة، ففيها أكبر قبيلتين اقتتلا الأوس والخزرج، وهما من القبائل التي تسود متى حلت، فضلا عن اليهود الذين طالما أوقعوا العداوة بين الأوس والخزرج، وقدموا أسوأ أنواع غرس العداء وإشعال الحروب، هذا فضلا عن المشركين في المدينة(٢)، وقد وضع الرسول ﷺ كل ذلك في اعتباره.

العدالة الاجتماعية في الهجرة إلي المدينة المنورة

ونجحت أسباب الهجرة النبوية الشريفة ليذهب الرسول ﷺ إلى المدينة المنورة، ويؤسّس الدولة الأولى في الإسلام، وقد مرّت حوادث مؤلمة أثناء الهجرة حيث ظهرت عداوة القريشيين في التفريق بين الرجل وزوجته وأخذ أولادهم، وصادروا أموالهم وأخذوها وأخذوا ديارهم وكل ذلك من وسائل انتهاك العدالة الاجتماعية، كما لجأوا إلى أسلوب الحبس وإيقاع الإيذاء والتطليق ونحو ذلك، وتنوع الحبس حتى

---

(١) فتح الباري،رقم الحديث: ٧٠٥٦،٨/٥٧

(٢) غنيم،د.عبد العزيز،أضواء على السيرة النبوية،مكتبة الحسين،القاهرة،١٩٨٠م،ص: ١١٨

بلغ أن وضعوا عياش، وهشام بن العاص (كمثل ومثلهم كثير) في حجرة عالية الأسوار بدون سقف حتى يتعرضوا لحرارة الشمس القاسية في الصباح وذلك زيادة في التعذيب[١].

وحين بلغ النبي ﷺ المدينة كان يدعو لهم بالاسم في الصلاة أن ينجيهم من مظالم الكفر في مكة، روى البخاري أنه كان يدعو ﷺ فيقول: «اللَّهُمَّ أَنْجِ عَيَّاشَ بْنَ أَبِي رَبِيعَةَ، اللَّهُمَّ أَنْجِ سَلَمَةَ بْنَ هِشَامٍ، اللَّهُمَّ أَنْجِ الوَلِيدَ بْنَ الوَلِيدِ، اللَّهُمَّ أَنْجِ المسْتَضْعَفِينَ مِنَ المؤْمِنِينَ، اللَّهُمَّ اشْدُدْ وَطْأَتَكَ عَلَى مُضَرَ، اللَّهُمَّ اجْعَلْهَا سِنِينَ كَسِنِي يُوسُفَ»[٢]، وكل هذا كان انتهاكا للعدالة الاجتماعية وشيوع في ممارسة الظلم، ولم يقف النبي ﷺ مكشوف الأيدي، بل أرسل لهما من يطلق سراحهما وقد فعل[٣].

الرحمة الممزوجة بالعدالة الاجتماعية

وضع النبي ﷺ للمسلمين سبل المحبة والتكافل الاجتماعي، وقد نجحت هذه الأخوة بدرجة عالية كبيرة ففتح الأنصار بيوتهم للمهاجرين الذين حملوا الدعوة وجاؤوا بها، فالبيت الواحد من بيوت الأنصار جمع بين المهاجر والأنصاري، وتقاسموا المأكل والمال والمسؤولية، وعرفت أشهر بيوت الأنصار بذلك، من أشهرهم: دار مبشر بن عبد المنذر حيث نزل عنده مجموعة من الرجال والنساء، وقد ضمت هذه الدور عمر بن الخطاب وبعض أهله، وعياش بن أبي ربيعة... وغيرها من الديار[٤].

وكانت هذه الصور من الترابط الاجتماعي قد جلبت لهم الثناء من الله تعالى حيث قال عزوجل: ﴿والسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ والْأَنْصَارِ والَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ ورَضُوا عَنْهُ وأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَلِكَ الْفَوزُ الْعَظِيمُ﴾[٥]، في حين كانت هذه المبادئ القويمة القاعدة الأساسية التي بنيت عليها مبادئ العدالة الاجتماعية.

أهل الصُفّة والتجربة الحيّة

هم فئة من المهاجرين لم يجدوا مكانا في ديار الأنصار، فكانوا يسكنون المسجد، فكان من لم يتيسر له مكانا يأوي إلى تلك الصفة بالمسجد واتسعت حتى كانت عبارة عن مخيم كبير بجوار المسجد أيضا[٦]. وعرف هذا المكان بالاستضافة فيما بعد، وكان ينزل به الوفود التي كانت تأتي للنبي ﷺ.

---

(١) السيرة النبوية لابن هشام،١/٣١٤

(٢) صحيح البخاري،كتاب الاستسقاء،رقم الحديث: ١١٠٦،٢/٢٢

(٣) السيرة النبوية لابن هشام،١/٣١٤

(٤) السيرة النبوية لابن هشام،١/٤٦٨،٤٦٩

(٥) سورة التوبة،الآية: ١٠٠

(٦) الشامي،صالح أحمد،السيرة النبوية تربية أمة وبناء دولة،المكتب الإسلامي،القاهرة،بيروت،ص: ١٧٥

وكان المسلمون مهاجرون وأنصار يرعونهم ويهتمون بهم واستدعت فريضة العدالة الاجتماعية أن يكونوا في طليعة الاهتمام، وكان الرسول ﷺ بنفسه يشرف على راحتهم، فليس من العدالة الاجتماعية أن يتشتت هؤلاء ولا يجدون المأوى المناسب لهم، وكان من أشهرهم الصحابي الجليل أبو هريرة ﷺ وغيرهم، وكان هؤلاء أهل الصفة من العاملين والمجاهدين ومنهم من حكم في البحرين فيما بعد، وقد ذكرت كتب السيرة أسماءهم(١).

العدالة الاجتماعية في المؤاخاة بين المهاجرين والأنصار

حرص النبي ﷺ دائما على التآخي بين المسلمين منذ الوهلة الأولى للدعوة الإسلامية، فقالﷺ: «لاَ تَبَاغَضُوا، وَلاَ تَحَاسَدُوا، وَلاَ تَدَابَرُوا، وَكُونُوا عِبَادَ اللَّهِ إِخْوَانًا، وَلاَ يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلاَثَةِ أَيَّامٍ»(٢).

وقال أيضا: «المسْلِمُ أَخُو المسْلِمِ لاَ يَظْلِمُهُ وَلاَ يُسْلِمُهُ، وَمَنْ كَانَ فِي حَاجَةِ أَخِيهِ كَانَ اللَّهُ فِي حَاجَتِهِ، وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً، فَرَّجَ اللَّهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرُبَاتِ يَوْمِ القِيَامَةِ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللَّهُ يَوْمَ القِيَامَةِ»(٣).

وهنا يظهر النبي ﷺ نهيه عن التحاسد والتباغض بين المسلمين دون النظر إلى جنس ولون أوحسب ونسب، فالأخوة موجودة دون النظر إلى العنصرية والأنساب ولا ذلك.

ويؤكّد ذلك قوله: «والمسلمون تتكافأ دماؤهم، يسعى بذمتهم أدناهم، وهم يد على من سواهم»(٤). وهذا النص النبوي الشريف يصب في قالب العدل الاجتماعي مباشرة، فدم المسلم الغني سواء بسواء مع دم المسلم الفقير، وفي الحديث أن من حق المسلم الضعيف أن يطالب بحق دم المسلم ولو كان ملكا متوجاً فكلاهما سواء ولا أفضلية لأحد إلا بميزان التقوى.

ولا يمكن لأي مجتمع أن يقوي على غير العدالة الاجتماعية بين أفراد هذا المجتمع إلا حينما يشعر أن كل أفراده متكافئون متعاونون لا يشعر أحد أنه أفضل من أخيه إلا بمعيار التقوى والإيمان.

وجاء الأمر الإلهي بقول: ﴿واعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا واذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوانًا وَكُنْتُمْ عَلَى شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ﴾(٥).

---

(١) ابن كثير،إسماعيل بن عمر،السيرة النبوية،دارصادر،بيروت،١٩٨٥م،ص: ١٨٠

(٢) صحيح البخاري،كتاب الأدب،باب ما ينهى عن التحاسد والتدابر،رقم الحديث: ٦٠٦٥،٨/١٩

(٣) صحيح البخاري،كتاب المظالم والغضب،باب لا يظلم المسلم المسلم ولايسلمه،رقم الحديث: ٢٤٤٢،٣/١٢٨

(٤) النسائي،أحمد بن شعيب،السنن،رقم الحديث:٤٧٤٦،تحقيق:عبد الفتاح أبو غدة،مكتب المطبوعات الإسلامية، حلب،١٩٨٦،٨/٢٤

(٥) سورة آل عمران،الآية: ١٠٣

وقد أشار بعض المؤرخين إلى أن المؤاخاة قد حدثت في المدينة بعد الهجرة وليس قبلها، وهذا من حيث النزول للآيات، ولكن هل كان هناك عداء بين المسلمين في مكة؟ بالطبع لا، ولكن من السوء أن يحكى مؤرخ مثل المسعودي نحو هذا الكلام، لكن الواقع أن هناك تآخيا وتآلفا قد بدأ في مكة، بنيت المؤاخاة فيها على الحق المواساة، فقد آخى النبي ﷺ –وهو في مكة– بين المهاجرين والأنصار(١).

ولكن ابن القيم يرى أن رواية البلاذري فيها ضعف، وأن المؤاخاة في مكة لم يكونوا في حاجة إليها، ولكن المجتمع الجديد بين المهاجرين والأنصار كان يحتاج لعقد تآخي دعما للترابط، أما المهاجرون فإن كل ما سبق خلق بينهم أخوة طبيعية حيث تجمعهم روابط أخرى كالنسب والدار والبلد الواحد(٢). وأيده في ذلك ابن كثير(٣). ولأن ابن قيم وابن كثير من المحققين المدققين فإنهما رفضا رواية البلاذري؛ لأنه لم يرو عن أحد، بل قال في روايته بلفظ "قالوا"، لذلك رفضوا روايته.

لكن النصيحة والترابط وأخوة الدين ومجابهة الظلم كل هذا في مكة خلق أخوة ظهرت معالمها جيدا، ولم يترتب عليها حقوقا شرعية كالتوارث مثلا.

أما انصهار قوميتين (مكة – يثرب) في قالب واحد كان يحتاج لعقد يثبت ذلك، وقد نجحت الأخوة في المدينة بسرعة مذهلة، تعدّ من معجزات النبي ﷺ، فقد خلق فيهم رجالاً أصحاب مواصفات خاصة يختلفون عن طراز البشر جميعا، ونزل قول الله تعالى: ﴿إِنَّمَا كَانَ قَولَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ ورَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وأَطَعْنَا وأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾(٤).

أما العدالة الاجتماعية التي خرجت من هذا التآخي فإن جميع الحضارات تتلاشى دونها وتسقط، فلم يسبق لأي حضارة أن وضعت رجالا من هذا النوع، وصفهم جل شأنه في القرآن الكريم: ﴿والَّذِينَ تَبَوءُوا الدَّارَ والْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ ولَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِمَّا أُوتُوا ويُؤْثِرُونَ عَلَى أَنْفُسِهِمْ ولَو كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ومَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾(٥).

ثم أكد على ذلك بقوله أيضا: ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ واتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾(٦).

---

(١) البلاذري،أحمد بن يحي،أنساب الأشراف،بيروت،١٩٨٠م،١/٢٧٠

(٢) الجوزية،ابن القيم،زاد المعاد في هدي خير العباد،تحقيق:ناصر الدين الألباني،دار ابن الجوزي،القاهرة،٢٠٠٨م، ٢/٧٩

(٣) السيرة النبوية للصلابي،ص: ٢٨٩

(٤) سورة النور،الآية: ٥١

(٥) سورة الحشر،الآية: ٩

(٦) سورة الحجرات،الآية: ١٠

ووضع القرآن ضوابط لهم شاهدا على أخلاقهم، قال تعالى: ﴿والَّذِينَ آمَنُوا مِنْ بَعْدُ وهَاجَرُوا وجَاهَدُوا مَعَكُمْ فَأُولَئِكَ مِنْكُمْ وأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَولَى بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾(١).

ويمكن لنا تلخيص الفوائد التي أظهرها التآخي والتي صبت في وعاء العدالة الاجتماعية فيما يلي:

١. غرس القيم والمبادئ المثالية التي تعلمهم التعود على العدالة الاجتماعية بشكل تلقائي.
٢. تذويب الفوارق الإقليمية والقبلية وهي من الأمور الصعبة جداً في عهود الجاهلية والمناخ القبلي.
٣. نجحت العدالة الاجتماعية في تنحية العصبية القبلية بشتى الصور.
٤. وقد بنيت العدالة الاجتماعية التي أرساها الإسلام أنه من المستحيل استئناف حياة إسلامية قوية إلا إذا ترك الجاهليون –في أي مجتمع– العصبية القبلية(٢).

وفي هذا التوقيت نزلت آيات مبهرة تؤكّد صلابة المجتمع، وأنه بفضل غرس مفهوم العدالة الاجتماعية فإن الرسول ﷺ سوف ينتصر بقوة الله وبقوة دفع الجماعة المؤمنة التي توحّدت وشعرت أنه لا فضل لعربي على أعجمي، ولا لأحمر على أسود إلا بالتقوى وأن هذا التوحد القلبي الرائع بين القبائل المتناحرة قد أصبح لحمتها وسداها نسيجا واحدا ينجح في مجابهة الأعداء. قال جلّ شأنه: ﴿وإِنْ يُرِيدُوا أَنْ يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللَّهُ هُو الَّذِي أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ وبِالْمُؤْمِنِينَ* وأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ لَو أَنْفَقْتَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مَا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ ولَكِنَّ اللَّهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ إِنَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾(٣).

الحفاظ على وحدة الجماعة

في ظل ترسيخ مفهوم العدالة الاجتماعية لابد وأن تكون هناك ثقافة لإصلاح بين الناس، فما يخلو مجتمع من المجتمعات إلا ويحدث فيه ما يعكر صفوف الجماعة بشكل عام، حيث تتراكم بعض المشكلات، لكن الإسلام قد صان الوحدة الإسلامية، وفرض نصوصا للمحافظة عليها من أجل أن تظل العدالة الاجتماعية على قيد الحياة.

فأنزل الله قرآنا يقول فيه: ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ واتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾(٤).

---

(١) سورة الأنفال،الآية: ٧٥
(٢) للمزيد انظر:السيرة النبوية،٢٩٦/١
(٣) سورة الأنفال،الآية: ٦٢،٦٣
(٤) سورة الحجرات،الآية: ١٠

وهنا نستخلص بعض الأمور للحفاظ على ما بناه الإسلام من العدالة الاجتماعية:

١. إن المؤمنين إخوة، وأقوى الأخوة هي أخوة الدين، ولا يوجد بين الأخوة كبير النسب ووضيع النسب، ولا حقير وشريف، فالأخوة ليس فيها كل هذه الفروق، وهذا يدعم فكرة العدالة الاجتماعية.

٢. إن الأسرة الواحدة، أو المجتمع الواحد قد تحدث فيه تمزقات من جراء كثرة الخلافات، فلابد آنذاك من وجود فريق يسرع بالإصلاح بين الناس ويقرب أسباب الفروق، وهذه الفتن لا ينجو منها أولئك الذين التزموا الصمت، ووقفوا موقف المشاهدين، فإن الله أمر هؤلاء أن يتحركوا للإصلاح فوراً، وأن كل ثانية تمرّ على حال المتخاصمين يحمل وزرها الصامتون المشاهدون، فمناخ الخصومة يستدعي كل أسباب الفرقة والعداء، الأمر الذي إذا طال استفحل شره.

٣. ربط الإسلام هذا العمل بالتقوى ولم يربطه بالهوى والميل إلى الظالم، فالسكوت تأييد للمخطئ وظلم للمظلوم، وإقرار لوضع خاطئ، ولا يمكن للعدالة الاجتماعية أن تنمو في ظل هذا المناخ.

صحيفة المدينة والعدالة الاجتماعية

وضع النبي ﷺ دستوراً للمدينة مملوءاً بالقيم والقوانين التي تصون العدالة الاجتماعية، فلم يتركها فقط لقلوب الناس لأنها تفسد كما يفسد الطعام، ولا علاج لها سوى إلقائها في حظيرة جهنم وبئس المصير، وكان هذا الدستور أو صحيفة المدينة قد أقرّت رسميا العدالة الاجتماعية بشتّى أبعادها[١]، والتي فيها حرص النبي ﷺ أنه تتكاتف كل فئة مع نفسها، ومع غيرها ووضع فيها أسس التعاون مع غير المسلمين وأن فيها المقدم هو صاحب التقوى والأنفع للمجتمع... انظر على سبيل المثال البند الثالث عشر من الوثيقة والذي يقول فيه النبي ﷺ: «وإنه من تبعنا من يهود فإن له النصر والأسوة غير مظلومين ولا متناصر عليهم»[٢].

وأيضا يلاحظ في البند ١٧ (السابع عشر) قوله ﷺ : «وأن المؤمنين (يكف) بعضهم على بعض بما نال دماءهم في سبيل الله»[٣].

---

(١) العمري،ضياء الدين،السيرة النبوية الصحيحة،دارالسلام للنشر والتوزيع،دمشق،٢٠٠٥م،١/٢٧٥

(٢) السيرة النبوية لابن هشام،٢/٢٠١

(٣) نفس المرجع والصفحة

خاتمة ونتائج البحث

- أُرسل الرسول مُحَمَّد ﷺ إلى قوم جاهلين، ولكن أتى لهم أسس العدالة بين الناس بدون أي تمييز بينهم، وهي أحكام العدل والتسامح والسلام والأخلاق الحميدة والاستقرار في النظام الاجتماعي.
- رد الرسول مُحَمَّد ﷺ كل المفاهيم الجاهلية مثل تفاخر اللسان، والعرق، والمستوى الاجتماعي، والقومية؛ لأن أخلاق القرآن تردّ بشدّة على مثل هذه التمايز بين الناس، وأن التفاضل هو في الإيمان بالله وفي التقوى.
- ويتجلى العدل الاجتماعي في مكة حين تتجمع الرؤوس كبيرها وصغيرها غنيها وفقيرها لا يتفاضل فيها نصيب عن عامة الناس، فيصتفون في صفوف واحدة، ويجتمعون في دار الأرقم ليتلمذوا علي يد النبي مُحَمَّد ﷺ، ولقد شعر المنتمون للإسلام بأنهم سواسية كأسنان المشط فعلا، لا فضل لعربي منسب قرشي أوعبد حبشي فقير.
- كما كسر نبينا ﷺ صنم العنصرية العصبية التي منتشرة بينهم، وأعلن بأن الناس جميعًا متساوون أمام الله، ويقول لهم النبي ﷺ: «أيها الناس ألا إن ربكم واحد ألا إن أباكم واحد لا فضل لعربي على أعجمي ولا لأعجمي على عربي ولا لأسود على أحمر ولا لأحمر على أسود إلا بالتقوى»[(١)].
- العهود التي عقدها نبينا مُحَمَّدﷺ في عهده مع أهل الكتاب والمشركين حققت العدالة في المجتمع، حيث توصَّل إلى عقد اتفاقيات مع أكثر من مائة من التجمعات إما عن طريق الرسائل أو التحدث معهم شخصيًا بهدف تحقيق السلام والوحدة الاجتماعية في مجتمع المدينة ذات البنية المتعددة الاتجاهات، ويُمثِّل ميثاق المدينة الذي حقق حرية الدين والإيمان على مستوى واسع.
- نجاح المسلمين بعد سنوات في فتح مكة وأوّل ما أرسوه هو العفو، ثم العدالة الاجتماعية، وتتتوج تعاليم السماء بحجة الوداع الذي صان فيها النبي ﷺ دماء المسلمين ووحدتهم، والحفاظ على هويتهم الإسلامية، وحفظ حقوق النساء[(٢)]، وشمل في خطبة الوداع كل شرائع الإسلام وغاياته وأهدافه وما أورع العدالة الاجتماعية التي رأيناها خلال هذه الرحلة الموجزة.

هذا وبالله التوفيق، وأصلّي وأسلّم على حبيب رب العالمين.

❁ ❁ ❁

(١) السيرة النبوية للصلابي،ص: ٢٨- ٣٩

(٢) الغزالي،مُحَمَّد،فقه السيرة،دارالدعوة،الإسكندرية،١٩٨٨م،ص: ٢٩٩

مخطوطات السيرة النبوية في الجامعات الباكستانية في القرن العشرين

(دراسة نقدية تحليلية)

Manuscripts in Respect on Prophetic Biography in the Universities of Pakistan in 20th Century

(A Critical and Analytical Study)

د.كفايت الله همداني*

ABSTRACT

Allah Almighty has kept many sources to save his eternal message, the golden words of his prophet ﷺ and his holy biography in the writings of different scholars. This shows the importance of our sacred heritage that includes the biography of the Holy Prophet ﷺ. These hand-written books (manuscripts) consist of the exegesis of Qur'ān, Jurisprudence, Principles of Exegesis of Qur'ān and Jurisprudence, morphology, syntactic and many other sciences related to Arabic language and literature. The researcher has evaluated the manuscripts about the biography of the Holy Prophet ﷺ written in different universities of Pakistan during MA, MPhil, and PhD in the 20th century. The research methodology followed in the research is descriptive. Each understudy manuscript is considered from different aspects that include different features of the work done, i.e. language of the manuscripts, details of the original text, references of Aḥādīth, pattern of footnotes, primary and secondary sources etc. The article is divided into three main sections in the following way: First deals with Islamic Arabic Manuscripts, Second are Manuscripts in Pakistani Libraries and third are evaluated Manuscripts about Sīrah of the Prophet ﷺ. The research would highlight value of the Manuscripts and the critical analysis of the mistakes found in Manuscripts and it would certainly improve their language, and research pattern.

Keywords: *Manuscripts, Biography of Prophet, thesis research, Pakistan*

* رئيس قسم اللغة العربية،الجامعة الوطنية للغات الحديثة،إسلام آباد،باكستان

الحمد لله الذي علم الإنسان بالقلم، وعلّمه ما لم يعلم، والصلاة والسلام على حبيبه المصطفى الذي شجّع أمّته على حصول العلم، وعلى آله وأصحابه، وعلماء أمته وسلفها الصالحين أجمعين. وأمّا بعد!

إنّ المخطوطات العربية الإسلامية هي تراثنا الفكري والعلمي والحضاري عبر العصور المتطاولة، وهي تمثّل تاريخنا الوضّاء العالي، وهي تعطينا تلك الثمرات العلمية الباهرة التي كان يملكها سلفنا الصالحون في عصر رقيّهم، لذا فإن جامعات العالم كلها والمؤسسات التعليمية مشغولة في جمع المخطوطات النادرة، وتحقيقها ونشرها. وكذلك الجامعات الباكستانية، الحكومية منها والأهلية مشغولة في هذا العمل الجليل.

ففي الجامعات الباكستانية تحقق المخطوطات العربية الإسلامية على مستوى ماجستير وماجستير الفلسفة (ايم فل) والدكتوراه، وهذه المخطوطات العربية الإسلامية ذات أنواع مختلفة، منها ما تتعلق بالقرآن، ومنها ما تتعلق بالسيرة النبوية، ومنها ما تتعلق بالتصوف والسلوك، ومنها ما تتعلق بالحديث وأصوله، التفسير وأصوله، الفقه وأصوله، ومنها ما تتعلق باللغة العربية وآدابها من النحو، والصرف، والشعر، والمعاجم وغيرها من العلوم التي تتعلق باللغة العربية وآدابها.

وأجمع في هذا البحث المخطوطات المحققة في السيرة النبوية وأقوم باستعراضها استعراضاً نقدياً تحليلياً، وقسمت بحثي إلى ثلاثة مباحث:

المبحث الأول: المخطوطات العربية الإسلامية

المبحث الثاني: المخطوطات العربية الإسلامية في المكتبات الباكستانية.

المبحث الثالث: المخطوطات المحققة المتعلقة بالسيرة النبوية.

المبحث الأول: المخطوطات العربية الإسلامية

المخطوط – كما يعرّفه المعجم الوسيط-: المكتوب بالخط لا بالمطبعة، وجمعها مخطوطات. وهذا التعريف يشمل كل نص كتب باليد كتابا كان أو غيره، والمقصود- هنا – الكتاب، وفي ضوء التعريف المذكور نستطيع أن نعرّف المخطوط (أو الكتاب المخطوط) بأنّه المؤلف المكتوب بالخط، والتسمية مأخوذة من (الكتابة الخطية) وهي تعنى: طريقة تسجيل رموز الكلام باليد [١]، ويقابله (المطبوع) وهو الكتاب المنسوخ بالمطبعة[٢].

(١) الفضلي،د.عبد الهادي،تحقيق التراث،جدة،دارالشرق،الطبعةالثانية: ١٩٨٢م،ص: ٤٢

(٢) المطبعة: الآلة الطباعية للكتاب وغيرها (ج) مطابع.والمطبعة:بفتح الميم المكان المعدّ لطباعة الكتب وغيرها. ومجتمع الآلات المستعملة في الطباعة (ج) مطابع.انظر:المعجم الوسيط،مجمع اللغة العربية،القاهرة،دار الدعوة، مادة (طبع)

ومن أحسن التعاريف للفظ (الكتاب) الذي نقصده هنا (مخطوطا كان أو مطبوعا) تعريف بول أو تليه الذي يصف الكتاب: بأنه دعامة من مادة وحجم معيّن: قد يكون من طية أو لفة معينّة تنقل عليه رموز تمثّل محصولا فكريا[١].

وتستخدم كلمة التراث أيضا في معنى المخطوطات، لذا نبين معنى التراث وتعريف التراث فيما يلي من السطور:

تعني كلمة (التراث) لغويا: كل ما يرثه الإنسان من أسلافه من ماديات، ومنه قول سعد بن ناشب[٢]: فإن تهدموا بغدر داري فإنّها تراث كريم لا يبالي العواقبا[٣]ومن هنا عرف الأستاذ عبد السلام هارون[٤]الكاتب المحقق بأنه "الذي صحّ عنوانه واسم مؤلفه ونسبة الكتاب إليه، وكان متنه أقرب ما يكون إلى الصورة التي تراها مؤلفه"[٥].

وعرّف الدكتور مصطفى جواد تحقيق النصوص بأنّه: "الاجتهاد في جعلها (يعني النصوص) مطابقة لحقيقتها في النشر كما وضعها صاحبها ومؤلفها من حيث الخط واللفظ والمعنى"[٦]

ونستطيع أن نخلص من كل هذا إلى التعريف التالي:

تحقيق التراث: هو العلم الذي يبحث فيه عن قواعد نشر المخطوطات. أو هو: دراسة قواعد نشر المخطوطات.

التحقيق مصدر لقولهم: حقق الرجل الكلام بمعنى صدّقه أو صدّق قائله أو قال: هذا شيء هو الحق مثل صدّق. [٧]

وفي الاصطلاح: نشر المخطوط بصورة صحيحة لتكون أقرب إلى الصورة التي وضعها المؤلف

---

(١) الحلوجي،د.عبد الستار،المخطوط العربي،القاهرة،١٩٦٧م،رسالة الدكتوراه،ص: ٥

(٢) هو سعد بن ناشب بن معاذ بن جعدة المازني التميمي شاعر إسلامي،توفي في أوائل القرني الثاني الهجري،انظر: الدمشقي،خير الدين الزركلي،الأعلام،دار العلم،الملائين،لبنان،٢٠٠٢،٨٨/٣

(٣) منظور الإفريقي،جمال الدين مُحَمَّد بن منظور،لسان العرب،مصر،بولاق،مادة (ورث) الباب ثاء والفصل واو

(٤) هو من أبرز محققي التراث العربي في القرن العشرين،لقد ألف وحقق أكثر من مئة كتب توفي سنة ١٤٠٨ للهجرة. السيد الجميلي الجيل الثاني أو الطبقة الثانية من المحققين الأعلام. مجلة الأزهر،الجزء العاشر،السنة الثامنة والستون،١٩٩٦م

(٥) هارون،د.عبد السلام،تحقيق النصوص ونشرها،بيروت،الطبعة الثانية: ١٩٨٥م،ص: ٩٢

(٦) جواد،د.مصطفى،أصول تحقيق النصوص،أملاه على طلبة ماجستير اللغة العربية بكلية الأداب ببغداد ص:٥٠

(٧) لسان العرب،٤٩/١٠

من ناحية النص، والأسلوب، واللغة [١].

التحقيق في اللغة والاصطلاح

كلمة "التحقيق" جاءت مصدرا من الفعل "حقق يحقق تحقيقا"، وأصل مادته الفعل المضعف العين (حقق)، وقد تولدت عنه معان عديدة، يرى ابن فارس أنّها تدور حول إحكام الشيء وصحته، ومما ذكره في هذا الصدد، يقال: ثوب محقق إذا كان محكم النسج، يقال: حققت الأمر وأحققته: أي كنت على يقين فيه[٢].

ويقال: أحققت الأمر إحقاقا إذا أحكمته وصححته[٣].

"وحققت العقدة أحقّها: إذا أحكمت شدها"[٤].

وجاء في لسان العرب، وحقه يحقه وأحقه كلاهما أثبته، وصار عنده حق لا شك فيه، وحق الأمر يحقه حقا وأحقه، كان منه على يقين تقول: حققت الأمر وأحققته إذا كنت على يقين منه[٥].

ولا بد من الإشارة هنا إلى أن المراد بالتراث المخطوط هو ما وصل إلينا من مؤلفات، ومصنفات مكتوبة بخط مؤلفها، أو بخط أحد النساخ قبل عصر الطباعة، وفي مقابل ذلك الكتب المطبوعة التي خرجت إلينا بواسطة آلات الطباعة في العصر الحديث، ويذهب عبد السلام هارون إلى "أن التراث هو تلك الآثار المكتوبة الموروثة التي حفظها التاريخ كاملة، أو مبتورة. فوصلت إلينا، وليس هناك حدود معينة لتاريخ أيّ تراث كان، فكلّ ما خلفه المؤلف بعد حياته من انتاج يعدّ تراثا فكريا، ولقد أصبح شعر شوقي، وحافظ، وحديث عيسى ابن هشام وآثار العقاد، والمازني تراثا له حرمته التاريخية وله مقداره"[٦].

على أن هذه النظرة فيها شيء من التوسّع حيث لا تقيد التراث المخطوط بزمن معيّن، والأولى تقييده إمّا بقولنا ما كان قبل عصر الطباعة الحديثة، وإمّا بأنّه هو ما ورثه السلف للخلف من كتب مخطوطة باليد، وصلت إلينا على هذه الصورة.

---

(١) البلخي،محمّد إبراهيم،دليل البحث العلمي ومصادره في الدراسات الإسلامية،بشاور،جامعة الإمام البخاري، الطبعةالأولى:٢٠٠١م،ص: ٣٩،نقلا عن قلالى(مذكرة في مناهج البحث لطلاب كلية الشريعة بالجامعة الإسلامية في مدينة الرسول ﷺ لم تطبع)،قسم المكتبة،ص: ٩

(٢) ابن فارس،معجم مقاييس اللغة،تحقيق: أ.عبد السلام محمّد هارون،القاهرة،١٣٧١هـ،٢/١٥-١٩،والأزهري، تهذيب اللغة،القاهرة،المؤسسة المصرية العامة للأنباء والنشر،الدار المصرية للتأليف والترجمة،الطبعة الأولى،٣/٣٧٧

(٣) تهذيب اللغة،٣/٣٨٢،ولسان العرب،١١/٣٣٣

(٤) الزمخشري،جارالله أبو القاسم،أساس البلاغة،دارالكتب المصرية،القاهرة،١٩٢٤م،١/١٨٩

(٥) لسان العرب،١١/٣٣٣

(٦) عبد السلام،محمّد هارون،قطوف أدبية حول تحقيق التراث،مكتبة السنة،القاهرة،١٩٨٨م،ص: ٢٩

تراثنا المخطوط، آفاقه وأهميته

تراثنا المخطوط آفاق فسيحة تتبلور من خلالها حضارة الأمة العربية والإسلامية، وحسبنا في تقدير ما أصاب تراثنا المخطوط من تلف وضياع أننا نفتقد اليوم قدرا كبيرا من المؤلفات القيمة التي تصادفنا في تراجم العلماء، والأدباء، وفي المصادر التي تعتني برصد حركة التأليف كالفهرست للنديم، وكشف الظنون وذيوله، ومفتاح دار السعادة، وكتب برامج العلماء، حيث لا نقف في هذه المصادر إلا على أسماء الكتب، ولا نجد لها أثرا في الواقع بعد البحث والتحري في مظانها، وعلى الرغم من ذلك فإن ما بقي من هذا التراث ووصل إلينا يعدّ مفخرة لأمتنا، ونحن أمة لها تراث خالد ومنجزات حضارية تدعوا إلى الفخر والاعتزاز، تلك حقيقة أثبتها التاريخ ولست بحاجة إلى أن أسوق الأدلة على ذلك، ولكننا بحاجة إلى الوعي بأن إحياء هذا التراث لابد أن يكون مبعث فخر واعتزاز لنا منجزات الماضي ودورنا الفاعل في مسيرة الحضارة الإنسانية، وكما يقول عبد السلام مُحَمَّد هارون:

"هذا التراث الضخم الذي آل إلينا من أسلافنا صانعي الثقافة الإسلامية العربية جدير بأن نقف أمامه وقفة الإكبار والإجلال، ثم نسمو برؤوسنا في اعتزاز وشعور صادق بالفخر والغبطة والكبرياء".

إنّ هذه الصيحات التي يرددها دعاة الاستعمار الثقافي يبغون بها أن ننبذ هذا التراث ونطرحه وراءنا ظهريا صيحة في واد، وكم لهم من محاولات يائسة يدورون بها ذات اليمين، وذات الشمال كي يهدموا هذا الصرح، ولكن تلك المحاولات لم تجد لها صدى عند من أمكنهم أن يضفوا على أنفسهم للاستعباد الثقافي من ضعاف القلوب، وأرفاء التفكير[١].

نشأة التحقيق وتطوره

قبل نشوء الطباعة في القرن العاشر الهجري كان المسلون يكتبون كتبهم بأيديهم، وكل من أراد الحصول على كتاب ليتقنه أو ليقرأه على الشيوخ بحث عن أصل صحيح مضبوط لهذا الكتاب، وكثيرا ما تكون الأصول موقوفة في المدارس أو المساجد حسب أحكام الوقف من عدم جواز بيعها وشرائها وإباحة النسخ منها لكل مسلم، فيجلس من أراد الكتاب في المدرسة أو المساجد ينسخه، أويستأجر من ينسخه، كما كانت هناك مهنة الوراقة، وهي بمثابة دور النشر في زماننا، وكان الورّاقون ينسخون الكتب المهمة ويبغونها، فينسخون من الكتاب الواحد عدة نسخ عند الحاجة من أجل ذلك تعددت نسخ بعض الكتب المشهورة، التي قد تبلغ مائتين أحيانا، وإذا فرغ الناسخ من نسخ نسخته قابل الكتاب وصححه.

يقول الأستاذ علي النجدي ناضف في كتابه "سيبويه إمام النحاة" كان للمسلمين القدماء

---

(١) تحقيق النصوص ونشرها،ص: ٥

عناية ملحوظة بضبط النصوص والمحافظ على صحّتها، كانوا يروون أخبارها بالسند حتى يرفعونها إلى أصحابها على نحو ما كانوا يصنعون بأحاديث الرسول ﷺ وكانوا ينسبون نسخ الكتب التي يكتبونها فرعا إلى أصل حتى يبلغوا بها أوائلها التي تحدّرت منها، وكانوا يقرؤونها معارضة على الأصول التي ينقلون عنها "ثم يشير إلى سند" كتاب سيبويه " بقوله:

"وهذا مثلا ما جاء في أول النسخة الخطية المحفوظة في دار الكتب المصرية برقم ١٤٠ عن نسبتها إلى سيبويه قال أبو عبد الله مُحَمَّد بن يحي: قرأت على ابن ولاّد وهو ينظر في كتاب أبيه، وسمعته يقرأ على أبي جعفر أحمد بن مُحَمَّد المعروف بابن النحاس، وأخذه أبوالقاسم بن ولاد عن أبيه عن المبرد وأخذه أبو جعفر عن الزجاج عن المبرد، ورواه المبرّد عن المازني عن الأخفش عن سيبويه"[١].

وهذا يعني أن المسلمين اهتموا بضبط كتبهم وتصحيحها وعرفوا التحقيق قديما وأنه كان منهجهم المتبّع في التأليف والنسخ قبل ظهور الطباعة في القرن العاشر الهجري/ الخامس عشر الميلادي.

صعوبات التحقيق والطريقة المثلى لمعالجتها

إنّ الصعوبات التي تعترض لسبيل نشر المخطوط وتحقيقه لا يمكن أن توضع لها حدود خاصة، فلكل مخطوط طبيعته التي ينفرد بها، واستغلاقاته التي يختص بها. على أنه يمكن القول بأن هناك مصاعب عامة تقوم في وجه من يتصدى لهذا العمل الخطير.

١- رداءة المخطوط من حيث نوع الخط الذي قد يكون غير متميز أو غير واضح النقط والإعجام أومكتوبا بخط تتصل فيه الحروف اتصالا مبالغا فيه أو ملتزما فيه قاعدة غريبة لا يمكن معرفتها إلا بالدربة المتواصلة، والمعالجة الصابرة وأخص بالذكر من ذلك المخطوط ذات الخط المغربي أو الأندلسي.

٢- رداءة المخطوط من حيث التحريف والتصحيف الذي يقع فيه كاتبه، أو من حيث الأسقاط بعضها بسبب جهل القائمين بصناعة التجليد، إذ يتجاوزون الحد المعقول في تسوية أطراف المخطوط. وقد يجيء هؤلاء القوم على نظام الكتاب فيضعون بعض أوراقه في غير موضعها فيوقعون قارئ النص في لبس كبير.

٤- غرابة الموضوع الذي يعالجه المخطوط، ولا سيما إذا لم يجد المحقق نظيرا لمخطوط في موضوعه.

٥- غرابة المخطوط في لغته. ونحن نجد لبعض قدماء المؤلفين أساليب خاصة وألفاظا تلزمهم ويلزمونها وتفهمهم ويفهمونها[٢].

---

(١) ناصف،علي النجدي،سيبويه إمام النحاة،القاهرة،الطبعة الأولى: ١٩٧٩م،ص: ١٥٤-١٥٥

(٢) تحقيق النصوص ونشرها،ص: ٩٨،٩٩

هذه هي أبرز الصعوبات التي تواجه محقق النص، ويمكن مواجهتها بمايلي:

١- أن يجمع المحقق أكبر عدد مستطاع من نسخ الكتاب الذي يعالجه، ويقابل بعضها ببعض مقابلة دقيقة كاملة مستوعبة.

٢- أن يعمد إلى تقليب مخطوطاته وتكرار قراءتها حتّى يألف خطّها ويعرف الاتجاه العام فيها.

٣- أن يلجأ إلى المراجع التي يظنّ أن المخطوط استقي منها، أو التي يرجع أنها قد استقت منه، ويستعين في التحقيق بمقابلة هذه على تلك ومراجعة كل منهما على الأخرى.

المبحث الثاني: المخطوطات العربية الإسلامية في المكتبات الباكستانية

إن في باكستان مجاميع عديدة لمخطوطات عربية وفارسية، وبها قدر كبير من نسخ مهمة ونادرة كذلك، وحسب قول الدكتور ظفر إسحاق الأنصاري:

"توجد في باكستان مائة وخمسون ألف مخطوطة، وخلال القرنين الماضيين حوّل عدد كبير من المخطوطات من دولتنا إلى أوروبا وأمريكا...وهي تحتاج إلى اهتمام العلماء ومحبي التراث الإسلامي". وفيما يلي نبين المكتبات الباكستانية التي تضم المخطوطات العربية والإسلامية:

١- المتحف الوطني لباكستان (كراتشي)

كان فيه سنة ١٩٨٣م عدد جميع المخطوطات ٣٩٤٦ مخطوطة حسب الفهرس الإجمالي للمخطوطات الفارسية، الفهرس الذي قام بإعداده الدكتور سيد عارف نوشاهي.

٢- مكتبة لياقت الوطنية (كراتشي)

كانت هناك بعض المخطوطات في هذه المكتبة ولكن لم يطبع فهرسها. وعندما تحولت عاصمة باكستان من كراتشي إلى إسلام آباد تحولت هذه المكتبة الوطنية معها أيضا، وتم افتتاحها في سنة ١٩٩٤م، وكان عدد المخطوطات في هذه المكتبة هو ٥٤٢ مخطوطة.

٣- جامعة بنجاب (لاهور)

إنّ جامعة بنجاب هي أقدم الجامعات الباكستانية، وفي مكتبها المركزية توجد ١٨٠٠٠ مخطوطة، ومنها ١٠٠٠ مخطوطة عربية وفارسية، و٨٦٧١ مخطوطة سنسكرتية وهندية، و١٦٩مخطوطة بنجابية، وقد أهدى بعض الشخصيات العلمية البارزة مخطوطاتها إلى هذه المكتبة منها البروفيسور حافظ محمود شيراني[١]، وقد قام القاضي عبد النبي كوكب الفهرس المفصل للمخطوطات العربية النادرة لمكتبة جامع بنجاب باسم "الخزائن".

---

(١) هو كاتب محقق هندي، كتب عدة كتب في اللغة الأردية والأدب الأردي (١٩٤٦)

٤– مكتبة بنجاب العامة (لاهور)

وهي واحدة من كبرى المكتبات الباكستانية، والتي أسست في البناية التاريخية "باره دري (أي ذات ١٢برج) وزير خان" سنة ١٨٨٤م. وفي المكتبة توجد حوالي ١٠٠٠ مخطوطة، منها عربية، وفارسية، وأردية، وبنجابية، وهندية، وكشميرية، وتركية، وبشتونية، وقد رتّب البروفيسور منظور أحسن عباسي تفصيل هذه المخطوطات أربعة مجلدات. وقد طبع فهرس ٢١٨ مخطوطة في سنة م١٩٦٤م وطبعت ضميمة الفهرس التفصيلي لـ ١٢٢ مخطوطة فارسية في ١٩٦٦م، هكذا يوجد التعارف التفصيلي لـ ٩٨١ مخطوطة في هذه الفهارس.

٥– مكتبة ديال سنغ الخيرية (لاهور)

أسست هذه المكتبة في لاهور سنة ١٩٢٨م وتوجد فها حوالي ١٠٠٠ مخطوطة وقد طبع فهرس هذه المخطوطات التفصيلي في خمسة مجلدات، وقدم فيه تعارف ٨٠٠ مخطوطة تقريبا.

توجد في هذا المتحف ١٤٠٠ مخطوطة عربية، فارسية، أردوية، بنجابية، وقد عرضت بعض الخطوطات النفسية في شرفات المتحف للزائرين.

٦– مكتبة بهاولفور المركزية

توجد فيها ١١٩ مخطوطة

٧– المكتبة العامة، خيربور سند

وجد فيها ٢٥٠مخطوطة

٨– مكتبة القائد الأعظم (لاهور)

توجد فيها ٥٠ مخطوطة.

٩– المكتبة الوطنية إسلام آباد.

توجد فيها ٥٤٢ مخطوطة.

وإضافة إلى ذلك توجد هناك كثير من المكتبات، والمؤسسات العلمية التي تضم فيها كثيرا من المخطوطات النادرة القيمة، منها مثلا مكتبة لياقت المحلية راولبندي، مكتبة لياقت العامة كراتشي، المكتبة العامة باغ، المكتبة العامة سكر، وكذلك معهد سندهيالوجي، حيدرآباد، المحضر الأدبي السندي، حيدر آباد، أكاديمية بشتور، بشاور، أكاديمية بنجابي الأدبية، لاهور، المؤسسة الحضارية الإسلامية، لاهور، مؤسسة ترقية أردو كراتشي، مؤسسة التحقيقات الإسلامية إسلام آباد، وعلاوة على هذا توجد في مدينة بهاولفور عدة مكتبات تضم المخطوطات، وهي كالآية:

١- مكتبة أج جيلاني.

توجد فيها ٣٩٠ مخطوطة حسب الفهرس الذي قام بإعدادها البروفيسور غلام سرور في الخمسينات، منها ٩٥ مخطوطة عربية، و٢٩٥ مخطوطة فارسية.

٢- الجامعة الإسلامية، بهاولفور

قسم المخطوطات لهذه الجامعة لم يعتن بجمع المخطوطات كثيرا، ولذا لم يوجد فيه كثيرا من المخطوطات. وأنّ عدد المخطوطات الموجودة فيه لا مزيد عن ٣٥ مخطوطة.

٣- مكتبة بهاولفور المركزية

اسم هذه المكتبة القديم هو مكتبة صادق للقراءة، وأسست في سنة ١٩٢٤م. والمخطوطات الموجودة فيها هي ٤٨ مخطوطة.

وهناك كثير من المخطوطات التي يمتلكها أشخاص مختلفة، تفصيلها كالآتي:

١- المخطوطات التي يمتلكها الدكتور عبد الرؤوف ظفر.

٢- المخطوطات التي يمتلكها الشيخ حافظ ثناء الله الزاهدي.

٣- المخطوطات التي يمتلكها الدكتور مُحَمَّد أفضل.

٤- المخطوطات التي يمتلكها الدكتور عبدالرشيد رحمت.

المبحث الثالث: المخطوطات المحققة المتعلقة بالسيرة النبوية

١- خلاصة السير في بيان ابتداء العالم وبعض أحوال خير البشر ﷺ

التأليف: الشيخ مُحَمَّد بيك بن يار، مُحَمَّد النقشبندي

الدرجة: أطروحة قدمت لنيل شهادة الدكتوراه في اللغة العربية وأدابها

الإعداد: مُحَمَّد قمر علي

الإشراف: د. ظهور أحمد أظهر

القسم: إنّ هذا الموضوع يتعلق بالسيرة

جامعة الباحث: جامعة بنجاب لاهور، باكستان، قسم اللغة العربية

الفصل الدراسي: لم يذكر الفصل الدراسي لا في داخل الرسالة ولا في خارجها.

كيفية الطباعة: تمت الطباعة بالخط اليدوي.

وعلى جبهة هذا المخطوط عنوان الكتاب "كتاب خلاصة السير في بيان ابتداء العالم وبعض أحوال خير البشر ﷺ ، تأليف الفقير إلى الله المبديء مُحَمَّد بيك بن يار مُحَمَّد سغفرالله له ولجميع المؤمنين والمؤمنات.

وتحت ذكر عنوان الكتاب وذكر المؤلف يأتي النص الآتي:

"وقف لله تعالى مُحَمَّد علي شاه وقفا صحيحا شرعيا والنظر فيه لنفسي ما دامت حيّا ومن بعد موتي من أولادي من كان أهلا إن كان لا أولاد وإلّا أبي من كان أهلا فالأرشد فالأرشد، لا يباع ولا يوهب، ومن بدله بعد ما سمعه فإنما إثمه على الذين يبدّلونه.٢١ صفر ١٣٥٥ هجري القدسي"

وعلى الجانب الأيسر من هذا النص بعض الأسماء يظهر أنها لبعض الذين ما زال الكتاب تحت ملكهم. والله أعلم.

المعلومات حول المتن

١- قد يوجد في المتن بعض الأغلاط الإملائية، ومثال ذلك ما أخطأ في الإملاء عند كتابه اسم: مُحَمَّد بن مرهب كتبه "مُحَمَّد بل مرهب".

٢- اهتم الباحث بكتابة المتن كله بشكل الفقرات.

٣- قام بإنشاء العناوين في أثناء كتابة المتن، وهذا يعني أنّ المحقق لم يذكر العناوين من سطور جديدة وبل ذكرها في المتن.

٤- ذكر العناوين بحجم كبير غير حجم المتن، وبالإضافة إلى ذلك قال في الهامش : "الإضافة لتسهيل المنال"

٥- اختار المحقق علامة للعناوين زيادة عليه وسهولة للقاري.

٦- كتبت الآيات بين العلامتين هاتين.

٧- الآيات القرآنية بدون تشكيل.

٨- حجم المتن العادي وحجم المتن لكتابة الآيات القرآنية متساو.

٩- إن المحقق اختار للأحاديث نفس الطريق الذي اختاره للآيات القرآنية، فحجمها كالحجم المختار للمتن تماما، وهي بدون الإعراب كالآيات القرآنية.

١٠- اهتم المحقق بكتابتها الأبيات للشعرية على النهج المطلوب. وهذا يعني بأنها كتبت في وسط الصفحة.

١١- استخدم باحثنا هذا علامات التراقيم على أكثر الأحيان.

المعلومات عن الهوامش

١- لا يوجد تخريج الآيات القرآنية في بعض الأماكن.

٢- لم يذكر تخريج الآيات بكاملها فيكتب رقم الآية دون ذكر رقم السورة، واكتفى بكتابة اسم السورة فقط. فيكتب الإحالة مثلا حسب الطريق التالي:

"سورة النصر آية: ١ "

٣- وأمّا إحالات الأحاديث فلم يسلك المحقق على أسلوب واحد لكتابة إحالة الحديث فإنّه قد يذكر الأبواب لكتب الأحاديث، وقد يتركها. ويذكر تخريج الأحاديث على النهج التالي: يذكر تخريج الصحيحين مثلا:

"صحيح البخاري ج: ٥ ص: ١٢٥"

"صحيح مسلم ١٤٥/٦(كتاب للباس والزينة)"

٤- ما اختاره المحقق من أسلوب كتابة إحالات الأحاديث، جرت عليه عادته في كتابة بقية الإحالات، ولنا ومثال في قوله:

" البداية والنهاية ٧/ ٣٠١ والوردي ١/ ٢٣٢"

٥- ذكر العناوين بحجم كبير غير حجم المتن، وبالإضافة إلى ذلك قال في الهامش: "الإضافة لتسهيل المنال"

٦- ثم إن المحقق قام بإصلاح الكلمات المُحْوّة، والمطرودة غير مقروءة فيقول مثلا: "في الأصل "حب".

ويقول تارة: "هذه الكلمات مطموسة في الأصل". وقد يقول: الأصل "رحل" والصواب كما أثبت"

المعلومات حول الفهارس الفنّية

١- تبدأ الفهارس الفنية من ص: ٦٧٨ للرسالة المحققة وتمتد إلى ص: ٧٩١.

٢- قام المحقق بكتابة فهرس الآيات حسب اسم السورة.

٣- قام بإنشاء الفهارس الفنية كله بشكل جديد وبحسب ترتيب ألفبائي.

٤- إنّ المحقق قام بإنشاء الفهارس.

٥- المصادر والمراجع يبلغ عددها إلى ٢١٨ مصدر ومرجع.

٦- إن المحقق قام بإنشاء الأرقام المسلسلة في المصادر والمراجع.

٧- ذكر فيها أسماء المؤلفين والمطابع وأماكن النشر سنين النشر والمعلومات الأخرى الهامة.

٢- الإكتفاء في فضل الأربعة الخلفاء

التأليف: إبراهيم بن عبد الله الوصابي اليمني الشافعي (٩٦٧هـ)

الدرجة: أطروحة قدمت لنيل شهادة الدكتوراه في اللغة العربية وآدابها.

الإعداد: مُحَمَّد إعزاز الحسن شاه

الإشراف: د. ظهور أحمد (نجمة الإمتياز) رئيس قسم اللغة العربية بكلية الشرقية بجامعة بنجاب بلاهور. باكستان.

القسم: إن هذا الموضوع يتعلق بالسيرة.

جامعة الباحث: جامعة بنجاب، لاهور باكستان، قسم اللغة العربية.

الفصل الدراسي: ١٩٩١م

كيفية الطباعة: تمت الطباعة بالخط اليدوي

منهج المؤلّف وصفة المخطوط.

إنّ المحقق يقول: مؤلف المخطوط رحمه الله سلك مسلك القدماء في جمع الروايات والآثار، وقد استوعب ما أمكن الوقوف عليه بدون أن يتحرى الصحة في مروياته.

ثم إن المؤلف من عادته بأنه رحمه الله تعالى ينقل حرفيا بدون تغيير الكلمة أو بتصرف يسير، أحيانا ينقل صفحات بدون ذكر أو إشارة إلى كتاب المستخرج منه، كما هو المشاهد في الكتاب الرابع فيما جاء في فضل عثمان ابن عفان رضي الله عنه، وما ذكره في كتابه الرياض النضرة، فلم يأت المؤلف رحمه الله بأدنى إشارة إلى الكتاب المستخرج منه، فالناظر يفهم بأنّ هذا كله من عند المؤلف رحمه الله تعالى، وليس الأمر كذلك، وهذه ناحية محيرة، والله تعالى أعلم.

ثم إن طريقة تأليفه هو أنه أولا تجمع المواد بكامله خلال ثلاث سنوات، ثم في ثلاث سنوات أخرى رتّبه تحت أبواب وفصول، ويبلغ عدد مرويات الكتاب إلى ٢٢٣٤رواية وفق ترقيم المحقق. إنّ المؤلف رحمه الله تعالى فرغ من الجمع والترتيب في الثاني عشر من ربيع الأول سنة ٩٦٣هـ.

ثم تخريج الحديث والأثر لدى المؤلف رحمه الله تعالى بأنه يسوق أسماء متون الكتب السنة من الصحاح والسن والمسانيد والأجزاء والجوامع بدون ذكر الصفحة، أو الجزء وأسماء المصادر المذكورة أحيانا لا يتفق تماما بأسماء الكتب المتداولة المطبوعة تحت أيدينا على سبيل المثال.

" أخرجه الإمام مالك في صحيحه" وليس للإمام صحيح غير كتاب الموطأ بما تحت أيدينا واسمه المعروف المتداول الموطأ للإمام مالك رحمه الله تعالى.

وقد يذكر أسماء مختلفة لكتاب واحد كما يقول:

" أخرجه عبد الرزاق في مسنده.

" أخرجه عبد الرزاق في مصنفه.

" أخرجه عبد الرزاق في جامعه.

فعبد الرزاق رحمه الله تعالى كتاب معروف باسم "عبد الرزاق" المطبوع.

المعلومات حول المتن

١- اهتم المحقق بقيام الأبواب والفصول فقسم المخطوط (قسمه المحقق بابا بابا، وفصلا فصلا)

٢- لم يقسم المتن في الفقرات المتواترة

٣- إنّ المحقق لم يفضّل كتابه بالآيات القرآنية كما لم يكتبها منفردة بحجم خاص لها.

٤- اهتم بإنشاء الأرقام المسلسلة للأحاديث كلها.

٥- اهتم بكتابة الآيات في علامة هذه "[ ]".

٦- أدرج الأحاديث يبلغ عددها إلى ٢٢٣٧ حديث.

٧- ذكر الأبيات كلها على الترتيب المطلوب عند المحقق.

٨- اهتم بذكر صفحات المخطوط الأصلية فيقول مثلا: (أ/ ٢١٢)، و(ب/٢١٢)

٩- إنّ المحقق وإن اهتم بذكر صفحات المخطوط الأصلية، لكنه لم يذكرها منفردا، وبل ذكرها في أثناء كتابة المتن.

١٠- أدرج علامات الترقيم كلها.

١١- كتب الميم على الأسلوب القديم، فكتبها مثلا: مـ " مثل "ثمـ " و" تمامـ " ولم يكتبها كاملة.

المعلومات عن الهوامش

١- يكتب إحالات الآيات على النهج التالي: " الواقعة " ٨٨"

٢- إن المحقق لم يختر أسلوبا واحدا لكتابة الإحالات، فإنه قد يذكر أسماء المؤلفين مع ذكر كتبهم، وقد يترك ذكر أسماء المؤلفين، والمثال على هذا قوله:

"معجم المؤلفين عمر رضا كحالة [ص: ٥٦ج١]"

٣- يشرح الكلمات الصعبة مع ذكر مصادرها.

٤- يصحح الخطأ الواقع في المتن مع تقابل النسخ.

٥- اهتم بتعريف الأماكن أيضا بطريقة جيدة.

٦- استعمل خطاً غير واضح للتفريق بين المتن والهوامش.

المعلومات حول الفهارس الفنّية

١- تبدأ الفهارس الفنية من ص: ١١٠٣ إلى الصفحة ١٢٣٧

٢- شرع الباحث فهرسة الموضوعات في بداية كل جزء.

٣- قام بإنشاء الفهارس حسب ترتيب ألفبائي.

٤- يذكر الآيات القرآنية مع ذكر رقمها، ولم يذكر السورة مع ذكر اسمها.

٥- اهتم بذكر أرقام الأحاديث.

٦- لم يذكر رقم الصفحة للمخطوط.

٧- اهتم بقيام فهرس أطراف الحديث والآثار على ترتيب ألفبائي.

٨- قام بإنشاء فهرسة مسانيد الصحابة ومن بعدهم حسب ترتيب ألفبائي.

٩- انضم في فهارس الرسالة فهرسة القبائل والفرق. وهذا أيضا على ترتيب ألفبائي.

١٠- يبلغ عدد المصادر والمراجع إلى ٩٠ عدد. كلها حسب أسماء الكتب.

١١- لم يهتم بكتابة علامات التراقيم، ولوذكرها الباحث لكان خيراً.

٣-كتاب الأدب

التأليف: أبو بكر عبد الله بن مُحَمَّد بن إبراهيم بن عثمان العبسي المعروف بابن أبي شيبة المتوفى عام ٢٣٠هـ .

الدرجة: بحث مقدم لنيل درجة الدكتوراه في اللغة العربية

الإعداد: مُحَمَّد رضا القهوجي.

الإشراف: أ.د. مُحَمَّد رضا خالد العلوي.

القسم: إنّ الموضوع يتعلق بالآداب والأخلاق النبوية على صاحبها الصلوات وآدابها.

الفصل الدراسي: لم يذكر

كيفية الطباعة: تمت الطباعة على آلة الكتابة

أهمية الكتاب: هذا الكتاب درة في مكتبات العالم الإسلامي، وصفحة مشرقة في مؤلفات المنهج الأخلاقي والسلوكي، ويد بيضاء للمسلمين والمسلمات ليطلعوا من خلاله على الأدب النبوي في السلوك والتعامل.

لقد جرت عادة أصحاب المسانيد والمصنفات أن يصنفوا الأحاديث حسب الموضوعات الفقهية

أو حسب رواة الحديث من الصحابة. ولقد أفرد ابن أبي شيبة في كتابه (المصنف) أبوابا في الأدب النبوي إلا أنه أراد أن يفعل ما لم يسبق إليه، فصنّف كتابه "الأدب" واختاره مما ثبت لديه، وجمعه من الأحاديث، وجعله في حجم وسط ليسهل حمله واقتناؤه بينما "المصنف" يقع في خمسة عشر جزءاً.

وقد قسم المؤلف الكتاب إلى جزئين صغيري الحجم، جمع في الجزء الأول (٢١٧) حديثا، موزعة على حوالي ٥٠ بابا. وفي الجزء الثاني تحدث عن مراقبة ما يتكلم المرء، وأن يجازي من أسدي إليه معروفا، كما أورد الأحاديث المأثورة فيما يجب فعله وقوله عند النوم، وعند الاستيقاظ وغير ذلك.

المعلومات حول المتن

١- المتن بشكل الفقرات من بداية الرسالة إلى نهايتها.

٢- اهتم المحقق بقيام العناوين لغرض التسهيل.

٣- لم يستخدم المحقق علامات التراقيم بشكل كامل.

٤- الرسالة كتبت على آلة الكتابة، ولهذا يجد قاري الرسالة هذه كثيرا من الكلمات والألفاظ غير واضحة.

٥- والعناوين لم يقم الباحث بإنشائها على الوجه المطلوب.

المعلومات عن الهوامش

١- إن محقق المخطوط أجاد بتقديم الهوامش بأحسن شكل.

٢- الكتب الواردة في المتن استخرجها المحقق، ثم اهتم بكتابتها في الهوامش حسب أسماء الكتب دون أسماء المؤلفين.

٣- إنّ الباحث اهتم بتراجم الأعلام الواردة في المتن، وجمع المعلومات المطلوبات حول الراوي، وهذا بشكل أحسن جدا.

٤- ومع ذلك أن المحقق ذكر حكم صحة الأحاديث الواردة في الهوامش مع ذكر المصدر، ورقم المجلد، ورقم الصفحة للكتب التي استعان بها عند كتابة حكم الأحاديث.

المعلومات حول الفهارس الفنية

١- تبدأ الفهارس الفنية من صفحة: ٦٤٠ للرسالة المحققة، وينتهي إلى ص: ٧٠٩ .

٢- اهتم الباحث بذكر فهرس الموضوعات أولا.

٣- ثم إن المحقق قسم الفهارس الفنية.

٤- الفهارس الفنّية كلها رتّبها المحقق على نحو ترتيب ألفبائي.

٥- إحالات الآيات القرآنية كتبت حسب أسماء السور.

٦- قام المحقق بإنشاء فهرس مراجع التحقيق.

٧- يبلغ عدد المراجع إلى ١٢٨مرجع.

٨- إنّ المحقق اهتم بكتابة الأرقام المسلسلة في بداية المراجع.

٩- ثمّ إنّ المعلومات المذكورة فيها على النحو التالي:

١- اسم الكتاب

٢- اسم المؤلف

٣- اسم المطبعة

٤- عدد الطباعة

٥- سن الطباعة

٦- مكان النشر

٧- سنة النشر

١٠- لم يذكر المحققق الاسم الكامل للمؤلف

١١- وكذلك لم يكتب سنين الوفيات للمؤلفين

وبالجملة يمكننا أن نقول بأنه قد أصاب وأجاد في تقديم الفهارس الفنية على وجه مطلوب عند المحققين.

٤- دلائل النبوة ومعرفة أحوال صاحب الشريعة ﷺ

التأليف: أبو بكر أحمد بن الحسنين البيهقي(٣٨٤-٤٥٨هـ)

الدرجة: رسالة علمية مقدمة لنيل درجة الدكتوراه في اللغة العربية وآدابها.

الإعداد: عزّ الدين حسين الشيخ.

الإشراف: د. عبد الجواد خلف.

القسم: إنّ الموضوع يتعلق بالسيرة النبوية على صاحبها الصلوات والتسليمات.

جامعة الباحث: الجامعة الإسلامية بهاولفور، باكستان، قسم الدراسات الإسلامية.

الفصل الدراسي: لم يكتب.

كيفية الطباعة: تمت الطباعة بآلة الكتابة.

أهمية الكتاب: كتاب دلائل النبوة لأبي بكر البيهقي من عيون ما صنف في السيرة والشمائل،

وقارئ هذا الكتاب يجد كنزا عظيما ومرجعا قيّما لا منافس له في موضوعه، تحرى فيه مصنفه إخراج الأحاديث والأخبار الصحيحة، وميزها عن الروايات الضعيفة ليكون القاري على بصيرة من أمره.

قد يورد الأخبار مطولة أحيانا في مكان ومختصرة مرّة في مكان آخر كتكرار قصة الجذع وحديث أم معبد وغيره.

نقل عنه الكثير من العلماء ک السيوطي في كتابه خصائص الحبيب، وابن كثير في البداية والنهاية، وصاحب السيرة الشامية في كتابه سبل الهدى والرشاد.

قال تاج الدين السبكي: وأمّا كتاب دلائل النبوة وكتاب شعب الإيمان ومناقب الشافعي، أقسم ما لواحد منهم نظير.

فكتاب دلائل النبوة يجد فيه القارئ متعة روحية، وأجواء إيمانية، كيف لا، والحديث حول خير البرية ﷺ .

المعلومات حول المتن

١- المتن منقسم بشكل الفقرات

٢- أقيمت العناوين لسهولة القارئ الكريم

٣- استعملت علامات التراقيم بتمامها، غير أنّ المحقق لم يلاحظ الفرق بين " ي" و" ى" ذات النقطتين.

٤- استخدمت علامة "نجم" قبل كتابة اسم الراوي

٥- قام المحقق بإنشاء الأبواب

المعلومات عن الهوامش

١- لم يلاحظ المحقق لكتابة الإحالات الأسلوب الواحد. (وستعلم كيف هذا)

٢- إنّ المحقق اكتفى على كتابة أسماء المؤلّفين فقط، ولم يذكر أسماء التأليفات معها. وهذا لا يستحسن عند المحققين قال مثلا: "فتح الباري (٨-٧٣٧)"

٣- قد يذكر المحقق الباب أو الكتاب الذي أخذ منه الحديث من كتاب الحديث، مثلا: "أخرجه مسلم في كتاب الإيمان"

٤- خرّج الكلمات الصعبة وذكر معانيها سهولة للقاري

المعلومات حول الفهارس الفنّية

١- أدرج المحقق الفهارس الفنية على نهاية كل جزء من أجزاء المخطوط الثلاثة.

٢- قام المحقق بإنشاء فهرسة المراجع والمصادر باسم "جريدة المراجع"، وهذا لا شك فيه أنّه شيء جديد وبعيد عن أساليب المحققين.

٣- المصادر والمراجع كلها رتبت على ترتيب أسماء الكتب.

٤- عدد المصادر يبلغ إلى ٧٦ مرجع فقط.

٥- لم يكتب الباحث اسماء كاملة للمؤمنين، وسني وفياتهم، وسني النشر والطباعة التي لا بد من ذكرها.

٥- مواهب العلام في فضائل سيدالأنام ﷺ

التأليف: الشيخ الإمام عبد الله بن مُحَمَّد السندي

الدرجة: أطروحة قدمت لنيل شهادة الدكتوراه في اللغة العربية وآدابها.

الإعداد: سيد طاهر رضوي بخاري.

الإشراف: د. ظهور أحمد (نجمة إمتياز) رئيس قسم اللغة العربية بجامعة بنجاب.

القسم: إنّ الموضوع يتعلق بفضائل سيدنا رسول الله ﷺ .

جامعة الباحث: جامعة بنجاب، بلاهور . باكستان قسم اللغة العربية وآدابها.

الفصل الدراسي: لم يذكر

كيفية الطباعة: تمت الطباعة بالخط اليدوي(١).

أهمية الكتاب: إن غرض المؤلف من هذا التأليف أن يدون فيه بعض ذكريات عن سيرة النبي ﷺ ، ومناقب خلفاء الراشدين، والأئمة المجتهدين والتراجم الموجزة للأولياء الصالحين لكي يزداد القراء حبّا من الرسول ﷺ بدراسة هذا الكتاب.

وهذه السيرة الفريدة من نوعها عن كل السير في جوانب شتى. قد جمع المؤلف أهم المعلومات في أسلوب سهل ميسر عن جميع جهات وأحوال السيرة من مولد النبي ﷺ إلى وفاته حديثا علميا تحقيقيا.

وقد عرض المؤلف أمام القارئين موضوعات السيرة الدقيقة بالأمانة الكاملة والحيطة التاريخية يزينها بحلية المحبة والتوقير والتحقيق فبذلك بلغ المؤلف بالمخطوط أرفع منزلة في موضوع السيرة. كتب المؤلف الأحوال الطيبة في نمط جذاب سهل واستشهد بالآيات القرآنية والنماذج من التعاليم النبوية.

---

(١) توجد هذه الرسالة في مكتبة مركزية بجامعة بنجاب بلاهور تحت رقم ١١٧-١١- T/Arf،لم يلصق المحقق صور المخطوط مع الرسالة. الغلاف الخارجي والغلاف الداخلي متساويان. ويبلغ عدد الصفحات إلى ٧٦٠. وطبعت الرسالة بالخط اليدوي

وقد ضمن هذا المخطوط كثيرا من المباحث تتعلق بأولاد النبي ﷺ ، وأهل بيته الأطهار، والصحابة الكرام لم يوجد ذكرها في كتب السيرة السابقة"[١].

وهذا كله ما يظهر به أهمية الكتاب.

المعلومات حول المتن

١- المخطوط كله بشكل الفقرات

٢- اهتم الباحث بقيام العناوين المختلفة

٣- إنّ المحقق قام بتقسيم المتن في فصول شتى

٤- استخدمت علامات التراقيم بشكل تام

٥- الأشعار كلها كتبت في وسط الصفحة

٦- إنّ المحقق اهتم بكتابة الآيات القرآنية بحجم كبير خاص، مع التشكيل الكامل

٧- الأحاديث لم تكتب في حجم كبير، بل اختار المحقق لكتابتها الحجم العام الذي اختاره للمتن

٨- الباحث يكتب"الصلوة والسلام" عند ما يكتب اسم مُحَمَّد ﷺ وكذا كتب "رضي الله عنه"، و"رحمه الله".

المعلومات عن الهوامش

١- يكتب الباحث إحالات الآيات الواردة في المتن على النهج التالي فيكتب مثلا:

"الآية الكريمة (٧) من سورة الحشر"

٢- يكتب الباحث اسم التأليف مع ذكر اسم المؤلف فمثلا:

"راجع المستدرك للحاكم"

"راجع الرياض النضرة في مناقب العشرة للإمام المحب الطبري"

٣- يصحح الأخطاء الواردة في المخطوط ويقول مثلا: "في الأصل قرءة"

المعلومات حول الفهارس الفنية

١- قائمة الفهارس الفنّية قام بإنشائها الباحث في نهاية الرسالة، فتبدأ الفهارس الفنّية من ص:٦٦٣ وتنتهي إلى ص: ٧٦٠

٢- رتب المحقق الفهارس الفنّية

٣- كل هذه الفهارس رتبت حسب ترتيب ألفبائي.

---

(١) السندي،عبد الله بن مُحَمَّد،تحقيق: مواهب الأعلام في فضائل سيد الأنام،ص: ٧٢،٧١

٤- الآيات القرآنية كتبت حسب أسماء السور.

٥- ثم إنّ المصادر والمراجع كلها رتبت حسب أسماء المؤلفين.

٦- إنّ المحقق لم يسلك على الأسلوب الأول خلال كتابة الإحالات فإنّه يكتب الإحالات في الهوامش حسب أسماء الكتب، وفي المصادر والمراجع ذكرها حسب أسماء المؤلفين.

٦- كتاب المثالب، برواية أبي جعفر مُحَمَّد بن أبي السدي.

التأليف: أبو المنذر هشام بن مُحَمَّد بن السائب الكلبي المتوفي سنة ٢٠٤هـ.

الدرجة: بحث قدم لدرجة الدكتوراه في اللغة العربية وآدابها.

الإعداد: أمجد حسن سيد أحمد.

الإشراف: أ. د. رانا مُحَمَّد نصر الله إحسان إلهي.

القسم: إنّ الموضوع يتعلق بالتاريخ والسيرة.

جامعة الباحث: جامعة بنجاب بلاهور- باكستان.قسم اللغة العربية وآدابها.

الفصل الدراسي: ١٣٩٧هـ / ١٩٧٧م.

كيفية الطباعة: تمت الطباعة بآلة الكتابة

المعلومات حول المتن

١- المتن كتب في شكل القراءات.

٢- قام المحقق بكتابة العناوين المختلفة.

٣- قسم المحقق المتن تحت أبواب مستقلة لكن لا تبدأ هذه الأبواب من الصفحة الجديدة، بل كتبها المحقق في أثناء كتابة المتن.

٤- الآيات القرآنية كلها مشكَّلة وفي حجم عام .

٥- إنّ المحقق كتب الأشعار في وسط الصفحة، وكتب معها أسماء بحورها وأوزانها.

٦- استخدمت علامات التراقيم بتمامها.

المعلومات عن الهوامش

١- رأينا أنّ المحقق قد يكتب اسم المؤلف واكتفى بكتابة اسمه، وقد يكتب اسم التأليف واكتفى بكتابة اسمه، والمثال لهذا التغاير كما يلي:

"رجع إلى الاستبصار (٣٤٠، ٣٣٩)، وكذلك الواقدي (٥٠٥)، الإصالة (٣٤/٧)، الاستيعاب (٦٤٥/٤) "

٢- قد يعتذر قائلا:

"لم أجد هذه الأبيات المذكورة "

أو يقول: "ولم أعثر على الأبيات فيما بين يدي من الكتب"

٣- يشير إلى الأخطاء التي يجدها في المتن قائلا: "في الأصل (إنّي لأنّي رجلا) تصحيف"

٤- وأمّا الإحالات القرآنية فكتبها المحقق بالنهج التالي:

" القرآن الكريم (٢٤/٨-٩)

٥- إنّ المحقق شرح تراجم الأعلام عند الضرورة مع ذكر مصادرها

٦- قد يزيد المحقق ما نقص في المتن فيقول مثلا: "مطموسة في الأصل، والزيادة من جمهرة أنساب العرب"

المعلومات حول الفهارس الفنية

١- إنّ المحقق قام بإنشاء الفهارس الفنّية.

٢- ثم إنّ المحقق لم يرتب الآيات حسب أسماء سورها، بل رتبها من حيث وردت على رقم صفحة المخطوط.

٣- والأحاديث والآثار كلاهما رتّبهما المحقق حسب ورودهما في المتن. ولم يهتم بأن يكتبهما على ترتيب ألفبائي.

٤- وأمّا القوافي فعلى خلاف ما جرى في فهارس الآيات، والأحاديث، والآثار إن المحقق رتبها على ترتيب ألفبائي.

٥- وكل الفهارس الفنّية الباقية فهي رتبت حسب ترتيب ألفبائي.

٦- وفي النهاية رتّب المحقق فهرس المصادر والمراجع حسب أسماء الكتب. يبلغ عددها إلى ١٢٢ عدد.

٧- العقد البديع في مديح الشفيع ﷺ

التأليف: الشيخ شعبان بن مُحَمَّد القرشي الآثاري المتوفى سنة ٢٨هـ.

الدرجة: تحقيق وتقديم لنيل درجة ماجستير الفلسفة اللغة العربية.

الإعداد: سميعة نازش عفرا.

الإشراف: أ.د. مسرت جمال، محاضرة بقسم اللغة العربية جامعة، بشاور ـ باكستان.

القسم: إنّ الموضوع يتعلق بفضائل النبي ﷺ .

جامعة الباحثة: جامعة بشاور، باكستان، كلية الدراسات الإسلامية واللغة العربية قسم اللغة العربية.

الفصل الدراسي: ١٤٢٠هـ /١٩٩٩م.

كيفية الطباعة: تمت الطباعة بالحاسوب الآلي.

التعريف بالكتاب: "العقد البديع في مديح الشفيع" قصيدة بديعية من قصائد عشرة لشيخ شعبان الآثاري. واسم هذه القصائد "المنهل العذب البديع في مديح المليح الشفيع"

رتّب هذه المجموعة فقصائد على مقدمة وتسع قصائد ورسالة موجزة وخاتمة.

أمّا المقدمة فهي في فضائل الصلاة والسلام على النبي الكريم ﷺ ، وإنّه قد وضع عنوانها "خير الكثير في الصلاة والسلام على البشير النذير"، ووزع هذه المقدمة على ثمانية أبواب وأتى في كل باب خمسة أحاديث البركة والتيمن، وختم المقدمة هذه بأبيات عديدة.

أمّا القصائد التي أدرجها في هذه المجموعات فيأتي اسم كل واحدة فيما يلي:

١- نيل المراد في تخميس بانت سعاد

٢- حل العقدة في تخميس البردة

٣- العقد البديع في مديح الشفيع

والذي حققت عليها الباحثة في هذه الرسالة فهي تشتمل على هذه القصائد التالية:

١. رفيع البديع في مديح الشفيع
٢. بديع البديع في مديح الشفيع
٣. غريب البديع في مديح الشفيع
٤. وسيلة الملهوف إلى أهل المعروف
٥. منتهى السول في معجزات الرسول ﷺ
٦. نزهة الكرام في مدح طيبة والحرام[١]

وأما الرسالة الموجزة فهي رسالة وجيزة في فضائل الصلاة والسلام على النبي ﷺ وسمّاها المؤلف.

المعلومات حول الفهارس الفنّية

١- تحقيق وتدوين المحققة بإنشاء الفهارس الفنّية

٢- ثم إنّ الفهارس الفنية كلها رتبتها المحققة على ترتيب ألفبائي.

---

(١) العقد البديع في مديح الشفيع،ص: ٣

٨- الكافية البديعية في المدائح النبوية

التأليف: الإمام صفي الدين الحلبي (بديعية الصفي)

الدرجة: الرسالة لنيل درجة ماجستير فلسفة اللغة العربية

الإعداد: رخسانة فضل علي.

الإشراف: أ.د. مسرت جمال، محاضرة بقسم اللغة العربية جامعة بشاور. باكستان.

القسم: إنّ الموضوع هذا يتعلق بفضائل النبي ﷺ .

جامعة الباحثة: جامعة بشاور . باكستان، كلية الدراسات الإسلامية واللغة العربية قسم اللغة العربية.

الفصل الدراسي: ١٤٢٠هـ / ١٩٩٩

كيفية الطباعة: تمت الطباعة بالحاسوب الآلي.

مميزات القصيدة: صفي الدين الحلبي له قصب السبق في قرض الشعر في مديح الرسول ﷺ في العصر المملوكي، وإنّه لا شك برع في إبداع البدائع من جميع أنواعها وفق أقرانه وأهل زمانه في ذلك الميدان فلذلك تأتي هنا بعض ميزات قصيدته الكافية البديعية في المدائح النبوية، نذكرها هنا بعضا منها وهي:

قد جمع ابن سريا في أبياته كلّ ما قال القدماء في الممدوح وحين قصور جمال خلقه وكرم أخلاقه في حسن وبشر، وشبهه بالبدر والبحر، وصور هيبته كأنه عسكر عرمرم وفي حشم كبير.

وتحدث بعد ذلك عن معجزاته ﷺ مثل سجود الأشجار وبكاء الجزع وكلام الأموات في القبور وحديث ذراع الشاة، وعدد الغزوات وختم بالرجاء والدعاء والتماس الشفاعة.

وقد كان في شعره كثيرا من التصنع والتكلف لأنواع البديع وهذه كانت ميزة عصره وقد نظم قصيدته في البحر البسيط، وعدد أبياتها مائة وخمسة وأربعون بيتا، وجمع فيها أنواع المحسنات اللفظية والمعنوية، وفتح بها طريق نظم البديعيات حيث ما جاء بعده عدا ما تكلفه من نظم قصائد حروفها مهملة أومعجمة أو خليط ما بين معجم ومهمل، وصنف عبد الغني النابلسي على هذه القصيدة شرحا سماه "الجوهر السني في شرح بديعية الصفي".[١]

المعلومات حول المتن

١- المتن مكتوب بشكل القراءات

٢- توجد في الرسالة عناوين كثيرة

٣- العناوين الموجودة لم تكتبها الباحثة بحجم كبير أكثر وضوحا من الحجم العادي

---

(١) الحلبي،صفي الدين،الكافية البديعية في المدائح النبوية،تحقيق:رخسانة فضل علي،ص:٣٤،٣٥ (شبكة آلوكة)

٤- استخدمت الباحثة علامات التراقيم في أكثر الأحيان

٥- إن الباحثة عند شرح المفردات لم تكتب شيئا إلا معنى اللفظ حتى لم تذكر المصادر التي أخذت منها معنى اللفظ.

٦- رأينا أنّ المحققة لم تكسل في تشكيل الآيات القرآنية، فكتبتها مشكّلة.

٧- وكذلك إحالات الأحاديث، إلا أنّها لم تشكّلها كما شكّلت الآيات القرآنية.

المعلومات عن الهوامش

١- إنّ الباحثة كتبت تراجم الأعلام باهتمام خاص.

٢- ثم ذكرت الباحثة الإحالات على النحو التالي: "تاريخ الأدب العربي تأليف أحمد حسن زيات صفحة. ٤-٥

٣- صححت الكلمات بعد أن تقابلتها بين النسخ الموجودة عندها. والمثال على ذلك: "في (ألف) جئت، في (ب) جبت، في (ج) جئت والصحيح ما في (ألف) و(ج)".

الخاتمة، وفيها أهم النتائج والتوصيات:

١. لقد وجدنا أن المخطوطات في الجامعات الباكستانية يصل عددها إلى أكثر من مئة ألف.
٢. ذكرنا في البحث أكثر من عشر مكتبات باكستانية تحتوي كتبا وبحوثا تمت طباعتها بالخط اليدوي.
٣. وذكرنا أيضا ما اهتم به الكاتب في مكتوبه المخطوط وما فات من اهتمامه كما ذكرنا طريقة كتابة المخطوط.
٤. وأشرنا أيضا إلى أبرز خصائص المخطوطات وما شانها من بعض النقائص والزلّات.
٥. المكتبات المليئة بالمخطوطات والجامعات التي قام فيها الباحثون بأطروحات لنيل شهادة الدكتوراه تدلّ على أهمية الخط اليدوي عند الأدباء والعلماء في باكستان.
٦. نوصي طلبة العلم والباحثين أن يبحثوا عن مثل هذه المخطوطات في مكتبات باكستان القديمة على حد واسع وأن يجمع صورها في مكتبات مختلفة كي يستفيد منها الأجيال القادمة.

❁ ❁ ❁